تعلیم و تربیت
سالنامہ
مئی
1989ء

اُنچاسواں سال ۔ دوسرا شمارہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر : عبدُالسلام

ایڈیٹر : ظہیر سلام

سینیئر اسسٹنٹ ایڈیٹرز : مقبول انور داؤدی، ڈاکٹر عبدالرؤف

جائنٹ ایڈیٹر : سعید لخت

آرٹ ڈائریکٹر : محمود حسن رُومی

سرکولیشن منیجر : الطاف احمد

ایڈورٹائیزنگ منیجر : مبشر علی خان

ڈسٹری بیوشن منیجر : شہزاد اصغر

اکاؤنٹس منیجر : محمد انور بھٹی

جنرل منیجر پروڈکشن : ایم جاوید خان

منیجر پلاننگ : فاروق عالم

سرکولیشن اسسٹنٹ : محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پبلشر : ظہیر سلام

پرنٹر : عبدُالسلام

شعبہ ادارت و اشتہارات

32۔ شارع بن بادیس (ایمپرس روڈ) لاہور

فون :- 63090-226819

سرکولیشن اور اکاؤنٹس

60۔ شاہراہ قائداعظم لاہور

فون :- 301196-97

راولپنڈی آفس

277۔ پشاور روڈ

فون :- 63503-64273

کراچی آفس

مہران ہائٹس ۔ مین کلفٹن روڈ

فون :- 537730

مئی 1989

قیمت فی پرچہ =/15 روپے

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

السلام علیکم

سب سے پہلے آپ کو عید مُبارک اور پھر تعلیم و تربیت کا سالنامہ مُبارک،

یہ عید آپ کے لیے دوہری خوشیاں لائی ہے ۔ خُدا کرے ایسی بے شُمار خُوشیاں آپ کو دیکھنا نصیب ہوں اور آپ ہمیشہ خُوش و خُرّم رہیں ۔ آمین!

سال نامہ کیسا ہے ۔ اِس کا فیصلہ تو آپ ہی کریں گے ۔ ویسے ہم نے اپنی طرف سے اِسے زیادہ سے زیادہ دِل چسپ اور خُوب صُورت بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ۔ ایک ذرا فہرست پر نظر ڈالیے ۔ اِس میں آپ کو بچّوں کے تقریباً تمام نام وَر ادیب اور شاعر نظر آئیں گے ۔ اِن کی تحریروں کے بارے میں اپنی رائے ضُرور لکھیے ۔

تعلیم و تربیت پاکستانی بچّوں کا واحد رسالہ ہے جس نے سب سے پہلے تاریخی کامکوں کا سلسلہ شُروع کیا ۔ اِس کا پہلا کامک "محمد بن قاسم" تھا، اور دُوسرا "سُلطان ٹیپو" جو پچھلے مہینے ختم ہوا ہے ۔ اِن کامکوں کی نہ صرف بچّوں بلکہ بڑوں نے بھی دِل کھول کر تعریف کی اور کہا کہ اِس مُفید سلسلے کو جاری رکھا جائے ۔

آپ کو یہ جان کر مسرّت ہو گی کہ اگلے مہینے سے ہم تیسرا سلسلہ وار کامک "شیر شاہ سُوری" شُروع کر رہے ہیں ۔ اُمید ہے یہ کامک بھی آپ کو بُہت پسند آئے گا ۔

اڈیٹر

فہرست مضامین

سارے جہاں کے مالِک، سارے جہاں کے والی
دُنیا میں سب سے بڑھ کر، تیری ہے شان عالی

تُونے ہی سب اُگائے، پھل پھول اور پودے
دُنیا کے باغ کا ہے، تُو اِبتدا سے مالی

تُو دو جہاں کا آقا، تُو دو جہاں کا مولا
کوئی بھی تیرے در سے، آتا نہیں ہے خالی

تونے بنائی دُنیا، تُو نے بسائی دُنیا
کرتی ہے ذِکر تیرا، گُلشن کی ڈالی ڈالی

یارب! ہماری تجھ سے، اتنی ہی بس دُعا ہے
خالی نہ جائیں تیرے در سے ترِے سوالی

خالد بزمی

مغرور شہزادہ

سیّد نظر زیدی

پُرانے زمانے کی بات ہے ، ملکِ شام پر ایک نیک دِل اور انصاف پسند بادشاہ حکومت کرتا تھا ۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ خُدا کی شان نرالی ہے ، گُلاب کے پودے میں کانٹے لگتے ہیں ، اس بادشاہ کا بیٹا بہت مغرُور اور ضِدّی تھا ۔

شہزادے کا نام تو عادِل تھا جس کا مطلب انصاف کرنے والا ہے ، لیکن انصاف سے اُسے کوئی تعلُّق نہ تھا ۔ وہ سمجھتا تھا کہ عزّت اور عیش آرام صِرف بادشاہوں کے لئے ہے ۔ عام لوگوں کا کام بادشاہوں کی خدمت کرنا اور اُن کا حکم ماننا ہے ۔ اپنے اس غلط خیال کی وجہ سے وہ اپنے اُستادوں تک کی عزّت نہ کرتا تھا ۔

بادشاہ اپنے بیٹے کی بُری عادتوں کی وجہ سے بہت پریشان تھا ۔ وہ یہ بات اچھّی طرح سمجھتا تھا کہ غُرور کرنے والے چاہے بادشاہ ہی کیوں نہ ہوں ، اُن کا انجام اچھا نہیں ہوتا ۔ اُن کے بُرے برتاؤ کی وجہ سے لوگ اُن کے دُشمن بن جاتے ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے اپنی تکلیفوں اور توہین کا بدلہ ضرور لیتے ہیں ۔

بادشاہ چاہتا تھا کسی طرح شہزادے کے دِل سے غرور نکل جائے اور وہ دوسروں کے ساتھ اچھّا برتاؤ کرنے لگے۔ اُس نے ضِدّی اور مغرور شہزادے کو تعلیم دینے کے لیے مُلک کے بہت قابل لوگوں کو مقرّر کیا تھا لیکن وہ اُن سے کچھ سیکھتا ہی نہ تھا ۔ جب بھی کوئی استاد اسے سبق پڑھانا چاہتا وہ ناراض ہو جاتا اور بگڑ کر کہتا "آپ ہماری رعایا ہیں ۔ آپ ہم سے زیادہ عقل مند کیسے ہوسکتے ہیں ؟ ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر چلے جائیے۔جو کچھ سیکھنا ہوگا ، ہم خُود سیکھ لیں گے"۔

ایسے بگڑے ہوئے بچّوں کا ایک اُستاد ڈنڈا بھی ہے ، جسے سکولوں میں "مولا بخش" کہا جاتا ہے ۔ لیکن یہاں یہ اُستاد بھی کچھ نہ کرسکتا تھا ۔ کیوں کہ بادشاہ اور ملکہ اپنے اکلوتے بیٹے سے بہت محبّت کرتے تھے ۔ اُن کا حال تو یہ تھا کہ اگر شہزادہ زور سے سانس بھی لیتا تو شاہی طبیب کو بُلوا کر اس کا معاینہ کراتے تھے کہ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہوگیا ۔ ایسی حالت میں غریب اُستاد مولا بخش سے کام لینے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے ۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے اور ضدّی شہزادے کو تعلیم دینے کا کوئی انتظام نہ ہو رہا تھا ۔ اس بات کا بادشاہ اور ملکہ کو تو رنج تھا ہی ، مُلک کے سمجھ دار لوگ بھی سخت پریشان تھے ۔ یہ سوچ سوچ کر وہ بہت فکر مند ہوتے تھے کہ بادشاہ کے بعد یہی شہزادہ اُس کی جگہ تخت پر بیٹھے گا اور اگر یہ ایسا ہی جاہل اور مغرور رہا تو غریب رعایا تباہ ہو جائے گی ۔ یہ لوگ ان باتوں پر غور کرتے تھے اور پریشان ہوتے تھے ۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ خدا چاہے تو بڑی سے بڑی مشکل دُور ہو جاتی ہے ، اِتّفاق ایسا ہوا کہ حجاز کا رہنے والا ایک عالم مُلکوں کی سیر کرتا کرتا مُلک شام میں آ گیا اور اُسے جو بادشاہ اور رعایا کی پریشانی کا حال معلوم ہوا تو ایک دِن بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر کہا "بادشاہ سلامت ، اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں شہزادے صاحب کے دِل سے غُرور اور ضِد نکال سکتا ہوں"۔

"اگر آپ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو ہم آپ کو اتنی دولت دیں گے کہ آپ کی سات پُشتیں عزت اور آرام سے زندگی گزاریں گی" بادشاہ نے خوش ہو کر کہا ۔

"عالی جاہ ! میں نے یہ کام کرنے کا ارادہ مال و دولت کے لالچ میں نہیں کیا ، بلکہ ثواب کے خیال سے کیا ہے ۔ اس لیے آپ سے ایک شرط منوانے کے عِلاوہ کوئی اور چیز نہیں مانگوں گا" عالم نے کہا ۔

"اگر کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس پر عمل کرنا ہمارے لیے مُشکل ہو تو ہم آپ کی شرط مان لیں گے" بادشاہ نے کہا ۔

"حضورِ والا ! اصل بات یہ ہے کہ شہزادے صاحب کے ایسا بن جانے کی وجہ حضور اور ملکۂ عالیہ کی محبّت بھی ہے ۔ اگر حضور شہزادے صاحب کو شروع زندگی ہی سے یہ بات سمجھا دیتے کہ پیار کے قابل صِرف وہ بچّے ہوتے ہیں جو ضِدّی اور گُستاخ نہ ہوں ، اور بُرے بچّوں کو سزا دی جاتی ہے ، چاہے وہ شہزادے ہی کیوں نہ ہوں تو شہزادے کی یہ حالت نہ ہوتی ۔ بہرحال،جو وقت گزر گیا ، اُس پر پچھتانا فضول ہے ۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ میں شہزادے صاحب کو نیکی کے راستے کی طرف لانے کے لیے جو کوشش کروں ، حُضور یا ملکۂ عالیہ کی طرف سے

اس میں کسی قسم کی رُکاوٹ نہ ڈالی جائے" عالم نے کہا۔ "ہمیں آپ کی یہ شرط منظور ہے" بادشاہ نے کہا۔ پھر اُس نے اپنے وزیر کو حکم دیا "اس نیک دِل اِنسان کے رہنے کے لیے اچھّے مکان اور دُوسری ضرورتیں پُوری کرنے کا انتظام کر دیا جائے۔"

حجازی عالم نے اپنا ایک چھوٹا سا اسکول اپنے مکان کے ایک حِصّے ہی میں قائم کیا۔ اس کے اسکول میں بادشاہ کے وزیروں اور امیروں کے بچّے پڑھتے تھے اور ان میں سے کئی بچّے شہزادے کے دوست تھے۔ حجازی عالم نے اپنے شاگردوں کو کتابوں کا سبق پڑھانے کے علاوہ گھوڑے کی سواری، تلوار چلانا، کُشتی لڑنا، لمبی دوڑ اور دُوسرے کھیل سکھانے کا بھی انتظام کیا تھا۔ شہزادے سے اُس نے بات ہی نہ کی اور نہ اُسے یہ معلوم ہونے دیا کہ اُس کے شاگرد کیسے عُمدہ ہنر سیکھ رہے ہیں۔

دو تین مہینے اِسی طرح گزر گئے اور جب حجازی عالم کے شاگرد کھیلوں اور لکھنے پڑھنے میں کافی ہوشیار ہو گئے تو اُس نے ایک دِن اُن سے کہا "بچّو! ہمارا دِل چاہتا ہے کسی دِن تم سب کو ساتھ لےکر شکار کے لیے جائیں۔ ہم نے تمہارے والدین سے اس کی اجازت بھی لے لی ہے۔ لیکن کیا ہی اچھّا ہو کہ تم شہزادے صاحب کو بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرو۔ اگر تم اُن سے شکار کا ذِکر کرو گے تو اُمید ہے وہ ضرور راضی ہو جائیں گے، کیونکہ وہ کھیل تماشوں کے بہت شوقین ہیں۔"

حجازی عالم کا اندازہ دُرست تھا۔ شکار کی بات سُنتے ہی شہزادہ اُن کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا اور پروگرام کے مطابق ننھے شکاریوں کی یہ ٹولی جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔ تمام بچّوں میں شہزادے کا گھوڑا سب سے زیادہ شاندار تھا۔ اُس کا لباس اور ہتھیار بھی سب سے اچھّے تھے۔ تلوار تو ایسی تھی کہ کیا کہنا۔ دستہ خالص سونے کا تھا جس پر ہیرے اور لعل جڑے ہوئے تھے۔ لیکن تلوار چلانے اور تیر کا نشانہ لگانے میں وہ ایسا نِکمّا تھا کہ پُورے مُلک میں شاید ہی کوئی بچّہ اُس سے زیادہ نالائق ہوگا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے یہ ہُنر سیکھا ہی نہ تھا۔

خیر صاحب، تو جب یہ ننھے شکاری جنگل میں پہنچ گئے اور ناشتا کرنے کے بعد کچھ دیر آرام کر چکے تو حجازی عالم نے اُن سے کہا "بچّو! یہ بات غور سے سُن لو کہ یہاں تم سب کی حیثیّت برابر ہے۔ یہاں نہ کوئی وزیر زادہ ہے نہ شہزادہ۔ تم سب ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہو۔"

"واہ! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم شہزادے ہیں اور یہ سب ہمارے نوکر ہیں" شہزادے نے بگڑ کر کہا۔

"ہو نہیں سکتا، بلکہ ایسا ہی ہے۔ یاد رکھو! اگر تم نے چیں پٹاخ کی تو ہم تمہیں کھیلوں میں حصّہ لینے سے روک دیں گے۔ ہم تمہارے اُستاد ہیں اور وہی ہوگا جو ہم کہیں گے۔ حضور بادشاہ سلامت نے یہ اختیار دے کر ہمیں یہاں بھیجا ہے بلکہ یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اگر کوئی بچّہ حُکم نہ مانے تو اُسے سخت سزا دیں" حجازی اُستاد نے سخت آواز میں کہا۔

شہزادے نے غُصّے بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی سپاہی نظر آئے تو اُستاد کو اِس گستاخی کی سزا دینے کے

لیے کہے ۔ اُستاد نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا اور مُسکراتے ہوئے کہا "اچھا تو بچّو ! دوسری بات یہ ہے کہ تمہیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں ملے گا ۔ تم جو شکار مارو گے ہم اُس کے پکوانے کا انتظام کر دیں گے اور تم سب اپنا اپنا مارا ہوا شکار کھاؤ گے ۔ تو اب شکار کے لیے روانہ ہو جاؤ ۔ خُدا تمہارا حافظ و نگہبان ہو۔ اور ہاں یہ بات بھی اچھّی طرح سمجھ لو کہ کوئی بچّہ ایک سے زیادہ جانور کو نشانہ نہ بنائے ۔ جو بچّہ ایک شکار مارنے میں کامیاب ہو جائے ، ڈیرے پر آجائے۔" سب بچّوں نے یہ بات مان لی اور شکار کے لیے روانہ ہو گئے ۔

شہزادے کے سوا سب بچّے گھڑ سواری اور تیر چلانے کی خُوب مشق کر چکے تھے ۔ اس لیے اُنہوں نے تھوڑی دیر ہی میں کوئی نہ کوئی جانور شکار کر لیا ۔ بس شہزادہ خالی ہاتھ رہا ۔ اگرچہ بادشاہ نے اُسے گھڑ سواری سِکھانے اور تیر تلوار چلانے کے گُر سکھانے کے واسطے مُلک کے بہترین اُستاد مقرّر کیے تھے ، لیکن اُس نے تاش اور شطرنج کھیلنے کے سوا کچھ سیکھا ہی نہ تھا ۔ ان کھیلوں سے دِل بھرتا تو گپ شپ اور شیخی بھری باتیں کرنے میں وقت برباد کر دیتا تھا ۔

اگر شہزادہ اپنے محل میں ہوتا تو اپنے دوستوں کو سزا دِلوا کر اپنی شرمندگی چُھپاتا لیکن وہ شہر سے بہت دُور جنگل میں تھا اور حجازی اُستاد نے اُسے بتا دیا تھا کہ یہاں انصاف کے خلاف کچھ نہ ہوگا ۔ اور انصاف یہی تھا کہ شہزادہ بھوکا رہتا ۔ کیونکہ وہ شکار سے خالی ہاتھ لوٹا تھا ۔

حجازی اُستاد کو پہلے سے اندازہ تھا کہ مغرور شہزادہ خالی ہاتھ لوٹے گا ۔ اُس نے ان باتوں کا اندازہ کرکے ہی شکار کا پروگرام بنایا تھا ۔ لیکن وہ شہزادے کو بُھوکا رکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ صرف یہ سبق دینا چاہتا تھا کہ اِنسان کو سچّی کامیابی اور سچّی عزّت اُسی وقت ملتی ہے جب اُس نے خوب محنت کرکے عِلم حاصل کیا ہو اور اچھّی عادتیں اختیار کی ہوں۔ چُنانچہ اُس نے شہزادے کو شرمندہ نہیں کیا بلکہ پیار بھری آواز میں کہا "بیٹے ہمارا خیال ہے اب یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہو گی کہ صِرف شہزادہ ہونا یا کسی امیر آدمی کا بیٹا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ عِلم حاصل کرنا اور ہنر سیکھنا بھی ضروری ہے ۔ انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب نوکر چاکر کام نہیں آتے بلکہ ذاتی قابلیت سے بگڑے کام بنتے ہیں ۔ آج تم صرف اس وجہ سے ناکام رہے ہو کہ تم نے شہزادگی کے غُرور میں نہ گھوڑے کی سواری سیکھی ، نہ تیر اور تلوار چلانے میں کمال حاصل کیا ۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا ۔ ہمیں اُمیّد ہے اب تم شوق سے عِلم حاصل کرو گے اور اچھّے اچھّے ہُنر بھی سیکھو گے ۔ آؤ وضو کرکے ہمارے ساتھ عصر کی نماز پڑھو۔ پھر ہم تمہارے کھانے کا انتظام کریں گے ۔"

شہزادہ اپنے اُستاد کی یہ باتیں سُن کر بہت شرمندہ ہوا ۔ لیکن ابھی اس کی کچھ اکڑ باقی تھی ۔ اُس نے اپنی آواز کو رُعب دار بناتے ہوئے کہا "لیکن جناب ! ہم آپ کے ان لڑکوں کے ساتھ نماز کس طرح پڑھ سکتے ہیں ؟ ہمارا جی چاہے گا تو الگ نماز پڑھ لیں گے ۔ ہم کوئی معمولی لڑکے نہیں ہیں ۔"

حجازی اُستاد نے بہت پیار سے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹے ! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ شہزادوں کی نماز اور ہوتی ہے ، عام لوگوں کی اور ؟"

"جی ، ہونی تو چاہیئے" شہزادہ غُرور بھری آواز میں بولا ۔

"لیکن ایسا نہیں ہے۔ بادشاہ اور معمولی کسان ایک ہی نماز پڑھتے ہیں اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ پاک نے سب انسانوں کو ایک جیسا درجہ دیا ہے ۔ کسی کا بادشاہ یا کسان ہونا تو صرف دُنیا کا انتظام چلانے کے لیے ہے" حجازی استاد نے شہزادے کو سمجھایا ۔

"آپ کا مطلب ہے ہمارے ابّا حضور بھی اُسی طرح نماز پڑھتے ہیں جس طرح اُن کے خادم پڑھتے ہیں ؟" شہزادے نے سوال کیا ۔

"بالکل اسی طرح پڑھتے ہیں ۔ تُم خود اُن سے پوچھ لینا۔"

ہمارا خیال ہے ، کہانی پڑھنے والے بچّے یہ بات سمجھ گئے ہونگے کہ بادشاہ نے حجازی اُستاد ہی کی بات کو ٹھیک بتایا اور شہزادے کو یہ بات ماننی پڑی کہ اللہ نے سب اِنسانوں کو ایک جیسا رُتبہ دیا ہے ۔ اب بتانے کے قابِل صرف یہ بات ہے کہ جب یہ بات شہزادے کی سمجھ میں آگئی تو وہ ایک اچھا بچّہ بن گیا اور بادشاہ نے اِس خُوشی میں حجازی اُستاد کو مالا مال کر دیا ۔

خوبصورت پھول

میرزا ادیب

اُس شام شازیہ نے جو اپنے چاروں طرف اتنے خوبصورت اور رنگارنگ پھول دیکھے تو حیران رہ گئی ۔ ایک پودے کے سامنے کھڑی ہوتی تھی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہیں کھڑی رہے اور آگے نہ جائے مگر جیسے ہی اُس کی نظر کسی دوسرے پودے پر پڑتی تو وہ بے اختیار قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتی تھی ۔ اب تک اُس نے جتنے بھی پھول دیکھے تھے وہ سب کے سب بہت ہی پیارے تھے لیکن جس وقت وہ باغ کے ایک ایسے حصّے میں پہنچی جہاں سارے پودوں میں ایک ہی پھول اپنی بہار دکھا رہا تھا تو بڑی حیران ہوئی ۔

یہ پھول تھا تو گلاب کا پھول ہی مگر عام پھولوں سے خاصا بڑا تھا ۔ اُس کی پتّیاں بے شمار تھیں اور ان پتّیوں کا سُرخ رنگ ڈوبتے ہوئے سورج کی شفق سے بھی زیادہ دلکش تھا ۔

وہ اُس پھول کو دیکھتی رہی ۔ دیر تک دیکھتی رہی ۔ ایسا پھول تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا ۔

یہ باغ شازیہ کی ایک امیر سہیلی کا تھا جس کا نام فرخندہ تھا ۔

فرخندہ اس کی نئی نئی سہیلی بنی تھی ۔ صرف چند ماہ پہلے اُس سکول میں داخل ہوئی تھی جہاں شازیہ تین سال سے پڑھ رہی تھی۔ اصل میں فرخندہ کا والد ایک بڑا افسر تھا جس کا حال ہی میں شازیہ کے شہر میں تبادلہ ہوا تھا اور اُسے رہنے کے لیے جو کوٹھی مِلی تھی وہ سرکاری تھی اور یہی وہ کوٹھی تھی ۔

اس کوٹھی میں جو صاحب پہلے رہتے تھے انہیں کوٹھی کے باغ میں نئے نئے پودے لگوانے کا بہت شوق تھا اور یہ پودا جس کا پھول شازیہ دیکھ رہی تھی اُنھوں نے نہ جانے کہاں سے منگوایا تھا ۔ اس پودے میں سارا سال صرف ایک پھول لگتا تھا اور بہار کے موسم میں کھل کر اتنا بڑا ہو جاتا تھا کہ باغ کا بڑے سے بڑا پھول بھی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا ۔

شازیہ پہلی مرتبہ اپنی سہیلی کے اس باغ میں آئی تھی ۔ اس کی سہیلی اُسے باغ میں چھوڑ کر خود اندر چلی گئی تھی کہ نوکرانی کو چائے تیار کرنے کے لئے کہہ دے ۔

نوکرانی کو چائے تیار کرنے کے لیے کہہ کر وہ واپس باغ میں آئی تو شازیہ اُس پھول کو دیکھ رہی تھی ۔

"کیوں کیسا ہے یہ پھول؟" فرخندہ نے سوال کیا ۔

"ہائے اللہ! اتنا پیارا ہے کہ میں تعریف ہی نہیں کر سکتی" شازیہ نے جواب دیا ۔

"شازیہ ! ایسا پھول شہر کے کسی باغ میں بھی نہیں ہو گا"

اور شازیہ نے اپنی سہیلی کی تائید کی ۔
تھوڑی دیر بعد نوکرانی چائے کی ٹرے لے کر آ گئی دونوں چائے پینے لگیں۔
اپنا کپ خالی کرنے کے بعد شازیہ کہنے لگی ۔
"فرخندہ ! آپ کو تو اس پھول پر بڑا فخر ہو گا۔"
"ضرور فخر ہے۔"
شازیہ نے ویسے ہی پُوچھ لیا ۔
"فرخندہ! اگر آپ کی کوئی سہیلی یہ پھول آپ سے مانگنا چاہے تو کیا کریں گی ؟"
فرخندہ بولی ۔
"میں پہلے تو دیکھوں گی کہ یہ پُھول میری کونسی سہیلی مانگ رہی ہے۔"
"فرض کیا وہ سہیلی آپ کی کوئی نئی سہیلی ہو ۔ کیا آپ اس سے ناراض ہو جائیں گی ؟"
فرخندہ نے شازیہ کی بات سمجھ لی اور ہنس پڑی ۔
"پہیلی کیوں بجھواتی ہو ؟ صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ یہ پُھول تمہیں بُہت پسند ہے اور تم ۔۔۔۔ اسے گھر لے جانا چاہتی ہو ۔
"یہی سمجھ لو ۔ تو کیا فیصلہ ہے تمہارا؟"
شازیہ سوال پہ سوال کئے جا رہی تھی ۔
"تم مانگو گی تو میں انکار نہیں کروں گی۔"

شازیہ خوش بھی ہوئی اور حیران بھی ۔ اُس نے فرخندہ کا شکریہ ادا کیا اور اپنے گھر چلی گئی ۔
رات سونے سے پہلے وہ پُھول کے بارے میں سوچتی رہی اور اُسے اپنی ایک دُور کی بہن نرگس کی سالگرہ کا بھی خیال آگیا جو تین روز بعد ہونے والی تھی ۔
نرگس نہ صرف اُس کی رشتہ دار تھی بلکہ پرانی سہیلی بھی تھی ۔ وہ اُس کی سالگرہ پر ضرور جانا چاہتی تھی اور سوچتی رہتی تھی کہ اُسے کیا تحفہ دے ۔
وہ اُسے کوئی ایسا تحفہ دینا چاہتی تھی جو باقی تمام تُحفوں سے بڑھ جائے ۔ یکایک اُس کے ذہن میں پھول کا خیال آگیا ۔۔۔ فرخندہ نے کہا تھا تم مانگو گی تو میں انکار نہیں کروں گی ۔۔۔ میں مانگ کر تو دیکھوں ۔ یہ پُھول میں نرگس کو اُس کی سالگرہ کے موقع پر دُوں تو سب لوگ حیران رہ جائیں گے ۔ کیا فرخندہ سچ مچ وہ پُھول دے دے گی ۔
وہ اس وقت تک اس بات پر غور کرتی رہی جب تک نیند اُس کی آنکھوں میں نہ آگئی ۔
سکول میں آدھی چُھٹی کے وقت اس کی ملاقات فرخندہ سے ہوئی تو کہنے لگی ۔
"فرخندہ ! کیا تم سچ مُچ انکار نہیں کرو گی ؟
فرخندہ نے فوراً جواب دیا ۔
"آزما کر دیکھ لو۔"

"تو پھر ۔۔۔۔"

شازیہ اپنا فقرہ مکمل بھی نہ کرنے پائی تھی کہ فرخندہ بول اُٹھی۔

"جب چاہو لے جانا۔"

اچانک شازیہ کے ذہن میں ایک سوال آگیا

"فرخندہ ! ممکن ہے تمہارے ابو امی کو یہ بات منظور نہ ہو۔"

فرخندہ کہنے لگی

"شازیہ ! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میری امی اور ابو پھول دینے پر ناراض ہوں گے تو میں اُس وقت انکار کر دیتی جب تم نے پھول مانگا تھا ۔ اب کہو کیا کہتی ہو؟۔۔۔"

"تو ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے؟" فرخندہ نے پوچھا۔

"ابھی سالگرہ میں دو دن باقی ہیں ۔ میں پرسوں شام سے ذرا پہلے پُھول لینے آؤں گی۔"

"آجانا اور خوشی سے لے جانا"

یہ گفتگو کرکے دونوں اپنی کلاس میں چلی گئیں ۔

سالگرہ کے روز شازیہ نے خُوب خُوب تیاری کی اور جب شام ہونے میں کوئی آدھ گھنٹہ باقی تھا تو اُسے خیال آگیا کہ اب فرخندہ کے باغ میں جانا چاہئے ۔ پھول لے کر اُدھر ہی سے نرگس کے ہاں چلی جاؤں گی ۔

وہ فرخندہ کی کوٹھی میں پہنچی تو اُس کی امی نے بتایا

"شازیہ بیٹی ! فرخندہ خود اپنی ایک عزیزہ کی سالگرہ پر اپنے بھائی کے ساتھ چلی گئی ہے اور کہہ گئی ہے کہ تُم آؤگی اور باغ سے پھول لے جاؤ گی ۔ تو بیٹی ! لے جاؤ وہ پھول ۔"

"بہت بہت شکریہ آنٹی !" یہ لفظ کہہ کر شازیہ باغ میں گئی ۔

سُورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا ۔ باغ میں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ پودے کا تنہا پُھول بہت ہی خوبصورت لگتا تھا ۔ شازیہ اُسے دیکھ رہی تھی کہ اُسے اپنے قریب ایک سایہ دکھائی دیا ۔ اُس نے ذرا غور سے اُدھر دیکھا تو ایک بوڑھیا کو پودے سے ذرا دُور کھڑے پایا ۔

"سلاماں لیکم بی بی" بوڑھیا نے آگے بڑھکر شازیہ کو سلام کیا

"وعلیکم السلام" شازیہ نے سلام کا جواب دیا ۔

"بی بی ! تم یہ پھول لینے آئی ہو نا ؟" بوڑھیا نے پوچھا

"ہاں اماں ! مگر آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا ؟"

بڑھیا چند لمحے خاموش رہی پھر بولی

"بی بی ! ہم دھوبی ہیں ۔ کوٹھی کے پاس ایک چھوٹا سا لال رنگ کا جو مکان ہے نا اُس میں رہتے ہیں ۔ میں کوٹھی سے میلے کپڑے لے جاتی ہوں اور دُھلے ہوئے کپڑے لایا کرتی ہوں ۔ آج فرخندہ بی بی اپنی امی سے کہہ رہی تھی : امی ! میری سہیلی شازیہ پھول لینے آئے گی۔ اُسے پھول توڑ کر لے جانے کی اجازت دے دینا ۔ میں نے یہ لفظ سُن لئے بی بی !"

"اچھا" شازیہ نے کہا اور اُس کا ہاتھ پھول کی طرف بڑھا ہی تھا کہ بوڑھیا بولی

"بی بی ! ایک بات کہوں؟"

"ضرور کہو اماں !" شازیہ نے بوڑھیا کی بات سننے کے لئے اپنا ہاتھ روک لیا ۔

"بی بی جی ! بات تو کوئی ایسی نہیں ہے ۔ تم نے کہا ہے تو کہتی ہوں ۔ میری پوتی ثُریّا جو ہے نا اُسے یہ پھول بُہت ہی پسند ہے ۔ جب تک کلی سے پھول نہیں بنتا ہر روز پودے کے پاس آکر دیر تک کھڑی رہتی ہے اور جب پھول بنتا ہے تو اتنی خوش ہوتی ہے ، اتنی خوش ہوتی ہے کہ کہہ نہیں سکتی ۔"

"اچھا یہ معاملہ ہے" شازیہ بولی

"جی بی بی جی ' یہ معاملہ ہے ۔ اُسے پتا چلے گا کہ پھول توڑا گیا ہے تو خبر نہیں کتنا دکھ ہو گا اُسے ۔ پاگل ہے ۔ یہ باغ تو کوٹھی والوں کا ہے ۔ اپنے باغ کا ہر پھول جسے چاہیں دے دیں ۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے بھلا ؟ بس میں یہ بات کہنا چاہتی تھی بی بی !"

شازیہ نے بوڑھیا کی طرف دیکھا ۔ لگتا تھا اس کی آنکھوں سے آنسو ابھی نکلے کہ نکلے ۔

شازیہ چپ کھڑی پھول کو دیکھتی رہی ۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ بوڑھیا کب وہاں سے چلی گئی تھی ۔

رات کی سیاہی پھیلنے لگی تھی جب کوٹھی کے پاس ایک چھوٹے سے سرخ رنگ کے مکان کے دروازے پر شازیہ نے دستک دی دروازہ اس بوڑھیا نے کھولا جو کچھ دیر پہلے باغ میں اس سے باتیں کر رہی تھی ۔

بوڑھیا شازیہ کو دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئی ۔

"کیوں بی بی !" اس نے پوچھا

"اماں جی ! آپ کی پوتی کہاں ہے ؟" شازیہ نے پوچھا

"وہ سامنے چارپائی پر لیٹی ہے ۔"

شازیہ اُدھر گئی ۔ ایک لڑکی ، جس کا چہرہ بڑا غمگین تھا ۔ تکیے پر سر رکھے لیٹی ہوئی تھی ۔ شازیہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اُٹھ بیٹھی ۔

"بہن : میں نے پھول نہیں توڑا اور نہ توڑوں گی تمہاری دادی اماں نے بتایا ہے کہ تمہیں اس پھول سے بڑا پیار ہے" وہ لڑکی چپ چاپ شازیہ کو دیکھے جا رہی تھی ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے ۔ شازیہ بولی ۔

"میں سالگرہ کے لئے کوئی اور تحفہ خرید لوں گی ۔ وہ پھول پودے کی شاخ پر کھِلا رہے گا" وہ لڑکی اب بھی خاموش رہی مگر اس کا چہرہ مُسکرانے لگا تھا ۔

اور شازیہ باہر آ گئی ۔ اور جلدی جلدی قدم اٹھانے لگی۔

پہچان

حنا خیری

اب کی دفعہ جو چھٹیاں ہُوئیں تو کاشف کے ابّو اور امّی نے پاکستان جانے کا پروگرام بنایا۔ کاشف کی امّی سوئس تھیں۔ وُہ سوئٹزرلینڈ میں ہی پیدا ہُوا۔ وُہیں پلا بڑھا۔ اُس کا خاندان سوئٹزرلینڈ کے ایک شہر زیورچ میں رہتا تھا۔ اُس نے پاکستان کے تذکرے بارہا اپنے ابّو سے سُنے تھے لیکن ابھی تک پاکستان نہیں گیا تھا۔ اس کے ابّو بھی اتنے سالوں میں صرف دو تین بار ہی گئے تھے۔

کاشف کے ددھیال والے کراچی میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اُس کے ایک چچا ان کے پاس کچھ دن کے لیے زیورچ آئے تھے اور ایک دفعہ اس کی ایک رِشتے کی پھوپھی اور پھوپھا بھی اپنے دو بچّوں کے ساتھ ان کے گھر آئے تھے۔ کاشف کو پاکستان سے کچھ خاص دل چسپی نہیں تھی۔ وہ پاکستان کے بارے میں یہی سمجھتا تھا کہ ایک غریب سا مُلک ہے جہاں گندگی، غلاظت اور غربت ہے۔ یہاں کے لوگ پُرانے خیالات کے ہیں اور یہ مُلک ترقّی کی راہ میں ابھی بہت پیچھے ہے۔

اب جو ابّو نے پاکستان جانے کا پروگرام بنایا تو کاشف کا مُنھ بن گیا۔

"یہ کیا، ابّو؟ آپ نے تو کہا تھا کہ اب کی چھٹیوں میں امریکا جائیں گے؟"

"ہاں، کہا تو تھا" ابّو بولے "مگر اب میں نے اِرادہ بدل دیا ہے۔ پاکستان گئے بہت دِن ہو گئے ہیں۔ اور پھر تم بھی تو اب تک اپنے دادا دادی اور دُوسرے رشتے داروں سے نہیں ملے ہو۔ اُن سے مل بھی لو گے اور سیر بھی ہو جائے گی۔"

کاشف جب کراچی ایئرپورٹ پر اُترا تو انھیں لینے اس کے چچا اور پھوپھی آئے تھے۔ اُنھوں نے کاشف کو گلے لگا کر خُوب پیار کیا۔ راستے بھر وہ بڑے شوق اور حیرت سے لوگوں کو، سڑکوں کو، گلیوں کو، عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ جدید طرز کی بلند عمارتیں اور بڑے بڑے خُوب صُورت مکان دیکھ کر اُسے بڑی حیرت ہُوئی۔

آخر کار اُن کی منزل آگئی۔ جُوں ہی وہ لوگ مکان کے اندر داخل ہُوئے، اُن پر پھُولوں کی پتّیاں نچھاور ہونے لگیں۔ کاشف بھونچکا سا کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے! اُن کے اِستقبال کو بہُت سارے لوگ کھڑے تھے۔ اس کی بڑی پھوپھی نے اس کے ابّو اور امّی کو ہار پہنائے اور اس سے تقریباً تین چار سال بڑی اس کی تایا زاد بہن نے اس کے گلے میں ہار ڈالا۔ اُسے یُوں لگ رہا تھا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اُس کے ابّو، دادا ابّا اور دادی امّاں سے گلے مِل کر رو رہے تھے۔ پھوپھیاں، چچیاں اور خاندان کی دُوسری عورتیں اس کی امّی کو گھیرے کھڑی تھیں۔ پھر اُس کی دادی نے اُس کی امّی کو بُلایا اور انھیں اپنے گلے سے لگا کر پیار کیا۔

"ارے! یہ کاشف ہے؟ کتنا بڑا ہو گیا ہے اور کتنا پیارا لگ رہا ہے!" اُس کی دادی امّاں بولیں اور اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کے بعد دادا ابّا نے بھی اُسے پیار کیا۔ تایا ابّا، چھوٹے چچا، بڑی پھوپھی، منجھلی پھوپھی کے عِلاوہ بہت سارے رشتے کے بھائی بہن بھی تھے جنھوں نے اُس کی خُوب آؤ بھگت کی۔

کاشف زندگی کے نئے انوکھے تجربے سے گزر رہا تھا۔ وُہ حیرت زدہ سا کھڑا سب کو دیکھے جارہا تھا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ لوگ اُس کا اِس طرح استقبال کریں گے۔ اس سے اِتنی محبت، پیار اور خلوص سے ملیں گے۔ اُس نے کبھی بزرگوں کو اِتنی محبت سے ملتے، اِتنا پیار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اُن کے چہروں سے خُوشی پھُوٹ رہی تھی۔ وُہ شرمایا سا بیٹھا تھا اور چور نگاہوں سے اُنھیں دیکھ رہا تھا۔

تین چار دِن اِسی طرح گزر گئے جیسے تین چار گھنٹے۔ لمحوں کا احساس ہی نہ ہُوا۔ سوئٹزرلینڈ میں تو ایک ایک لمحہ ایک ایک پل اِنسان کو یاد رہتا ہے۔ محسُوس ہوتا ہے۔ مگر یہاں یُوں لگ رہا تھا جیسے وقت کی کوئی اِنتہا نہیں ہے۔ کوئی اِبتدا نہیں ہے۔ وقت بہتے دریا کی طرح ایسے گزر رہا تھا کہ ایک مدھم سا دھم بھی سُنائی نہ دیتا۔ اُس روز چھوٹے چچا انھیں کراچی کی سیر کرانے لے گئے۔

"دیکھو، بیٹا۔ یہ ہے ہمارے عظیم قائد کا مزار" ابّو نے مزارِ قائد کی سیڑھیاں چڑھتے ہُوئے کہا "یہ قائدِ اعظم کی ہمّت اور حوصلہ تھا کہ آج پاکستان کا نام دُنیا کے نقشے پر جگ مگا رہا ہے۔ ہم سب آج جو کچھ بھی ہیں، پاکستان کی بدولت ہی ہیں اور پاکستان قائدِ اعظم کی اَن تھک کوششوں اور محنتوں کا صلہ ہے۔" اُنھوں نے عظیم قائد کو اپنا سلام پیش کیا۔ پھر قائدِ ملّت لیاقت علی خان، محترمہ فاطمہ جناح اور سردار عبدُالرب نشتر کی قبروں پر حاضری دی۔

جب وُہ سمندر پر پہنچے تو کاشف اور اُس کی امّی ششدر رہ گئے۔ کاشف نے تو سمندر صرف فلموں اور تصویروں میں دیکھا تھا۔ ساحلِ سمندر پر آنے کا اُس کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ بلند پہاڑوں کے خوب صُورت دیس سوئٹزرلینڈ کا باسی تھا، جو ایک سرد مُلک ہے۔ جہاں سُورج مہمانوں کی طرح آتا ہے۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سمندر اس قدر حسین اور اِتنا خوب صُورت ہو سکتا ہے۔ اُس نے اپنے ذہن میں سمندر کے متعلّق جو تانے بانے بُنے تھے، وہ وہاں پہنچتے ہی کچّے دھاگوں کی طرح ٹُوٹ گئے۔ سمندر اس کے خیال، اس کے تصوّر سے کہیں خُوب صُورت، کہیں انوکھا، دِل فریب اور حسین تھا۔ حدِّ نگاہ تک پھیلے ہُوئے پانی کی نیل گُوں وُسعتیں دیکھ کر اُسے یُوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے وُہ کوئی حسین سپنا دیکھ رہا ہو۔

وہ سمندر کی موجوں کو چھیڑتا، کنارے کنارے ٹہلنے لگا۔ سُورج کی کرنیں سمندر کے سینے پر جھلمل جھلمل کرتی اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ وہ اور اُس کی امّی سرد مُلک کے رہنے والے تھے۔ انھیں یہاں کی گرم ہوا نے بڑا متاثّر کیا۔ خُوب صُورت سمندر کی وُسعت نے انھیں دیوانہ سا کر دیا۔ وُہ بچّوں کی طرح خُوشی کا اِظہار کر رہے تھے۔ جو بات اس گہرے نیلگوں سمندر میں تھی، وہ بات بھلا پہاڑوں میں کہاں۔ جب وُہ واپس لوٹے تو بے انتہا خُوش تھے۔ اگلے روز رات کو اُنھوں نے چاندنی رات میں کشتی میں کیماڑی کی سیر کی اور بہت لُطف اُٹھایا۔

کاشف کی اُردو اب کافی بہتر ہو گئی تھی۔ اِتنے برسوں بعد وُہ لوگ آئے تھے۔ سارے خاندان نے اُن کی دعوتیں کیں۔ کبھی فلاں چچا کے ہاں دعوت ہے تو کبھی فلاں پھُوپھی کے ہاں۔ ابّو کے پُرانے دوستوں نے بھی ان کی خُوب خاطر مُدارت کی۔ کاشف کے ابّو کو

اچھا کھانا کھانے کا بہُت شوق تھا۔ اُن کے اِس شوق کو دیکھتے ہُوئے اُس کی امّی نے پاکستانی کھانا بنانا سیکھ لیا تھا۔ اِس کے لیے ان کھانوں کا ذائقہ کسی طور بھی نیا نہیں تھا۔ البتّہ کچھ کھانوں سے وہ ناآشنا تھا۔۔۔۔ اس کے ابّو نے اُسے اور اُس کی امّی کو پاکستان دکھانے اور گھُمانے کا پروگرام بنایا۔

سب سے پہلے وہ موہن جو دڑو پہنچے۔ اسے دیکھ کر تو کاشف اور اُس کی امّی حیران رہ گئے۔ اُس کے ابّو نے کہا "یہ شہر 2500 سال قبلِ مسیح آباد تھا۔ یہاں کے لوگوں کا رہن سہن، طرزِ زندگی، مُعاشرت سب کچھ ہمیں اُن چیزوں سے معلوم ہُوا جو یہاں سے برآمد ہوئی ہیں۔ اچھا خاصا بڑا شہر تھا۔ یہ دیکھو۔ یہ گھر ہیں، جہاں لوگ رہتے ہوں گے۔ یہ جگہ غسل خانے کے طور پر اِستعمال ہوتی ہوگی۔ یہ گلیاں 13 سے 33 فٹ چوڑی ہوں گی۔ مکانات پُختہ اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ بڑے گھروں میں ایک سے زیادہ منزلیں تھیں۔"

"یہ کیا ہے، ابّو؟" کاشف نے ایک طرف اِشارہ کیا۔

"یہ کنواں ہے۔ ہر گھر میں کنواں، غُسل خانہ اور نالیاں ہوتی تھیں۔"

اُنھوں نے وُہ تالاب بھی دیکھا جو ایک بہُت بڑا سوئمنگ پول تھا۔ کاشف اور اُس کی امّی یہاں ہر چیز کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ "کیا زبردست تہذیب تھی!" اُس کی امّی نے سر ہلا کے کہا۔ وُہ بہُت مُتاثّر دکھائی دے رہی تھیں۔ اُنھوں نے ایک ایک چیز بڑے شوق، بڑے اچنبھے سے دیکھی۔ ان کا جی نہیں چاہ رہا تھا وہاں سے جانے کو، لیکن مُسافر کو اپنا سفر جاری رکھنا پڑتا ہے۔

لاہور پہنچ کر کاشف کا دِل خُوش ہوگیا۔ سب سے پہلے اُنھوں نے بادشاہی مسجد کی سیر کی اور چھتوں اور دیواروں پر کی گئی مینا کاری اور نقش و نگار دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ شاہی قلعہ بھی ان کو بہُت بھایا۔ خاص طور پر شیش محل دیکھ کر تو ان کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ شالامار باغ اور جناح باغ بھی بہُت پسند آئے۔ کاشف جو سوئٹزرلینڈ کے باغوں پر نازاں تھا، یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں بھی اِتنے خوب صُورت باغ ہو سکتے ہیں۔

لاہور کی سیر کے بعد وُہ اسلام آباد پہنچے تو جدید طرز کا یہ خُوب صُورت صاف سُتھرا اور ہرا بھرا شہر کاشف کو بہُت پسند آیا۔ وہاں سے وُہ مری گئے اور پھر نتھیا گلی۔ دُور تک پھیلی ہُوئی پہاڑیوں پر چھایا سبزہ آنکھوں کو تراوٹ بخش رہا تھا۔ چیڑ اور صنوبر کے درخت جھُوم جھُوم کر اپنی موجُودگی کا احساس دِلا رہے تھے۔ ہر طرف کھِلے کھِلے خُوش نما اور خُوش رنگ پھُول بہار دکھا رہے تھے۔ یہاں پہنچ کے کاشف کو سوئٹزرلینڈ کا "ماؤنٹ پلاٹس" یاد آگیا جو سات ہزار فٹ بلند پہاڑ ہے اور جہاں لوگ ایک ڈبّے کی بجلی کی ٹرین میں بیٹھ کر پہاڑ پر پہنچتے ہیں۔ ٹرین بالکل سیدھی چڑھتی ہے اور نیچے گہرائیوں کی طرف دیکھنے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔

"چلو، اب تمھیں شاہراہِ قراقرم کی سیر کرائی جائے" ابّو نے کہا۔

"وُہ کیا ہے؟" کاشف نے پُوچھا۔

"پہاڑوں کو کاٹ کے پاکستان اور چین کے درمیان ایک سڑک بنائی گئی ہے جو بعض مقامات پر سترہ اٹھارہ ہزار فُٹ بلند ہے۔ اس کے اِرد گرد اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں جو برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ دُنیا کی دُوسری سب سے اُونچی چوٹی "کے ٹو" اسی پہاڑی سلسلے میں ہے۔

آخر کار وہ لوگ خوب صورت مناظر سے لطف اُٹھاتے ہوئے شاہراہِ قراقرم پہنچ گئے۔ پہاڑ برف کا لبادہ اوڑھے، سینہ تانے کھڑے تھے۔ یہاں کی خوب صورتی دیکھ کر کاشف سوئٹزرلینڈ کو بھول گیا۔ کہنے لگا "میں تو سمجھتا تھا کہ سوئٹزرلینڈ ہی خوب صورت ملک ہے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ پاکستان بھی اتنا حسین ہو سکتا ہے۔"

آخر کار جی بھر کے سیر کر کے، دریاؤں، ندیوں، پہاڑوں کو کھوجتے وہ لوگ واپس کراچی پہنچ گئے۔ اب ان کے جانے میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے تھے۔ سب پھوپھیوں، چچیوں، بھائی بہنوں نے اُنھیں تحفوں سے لاد دیا تھا۔ کاشف کی امی سندھی گلا، بلوچی لباس، کڑھی ہوئی شال۔ شیشے کے کام کی ٹی کوزی اور اجرک پا کر پھولی نہ سمائیں۔ دادی اماں کی اُن کے جانے کے خیال سے آنکھیں بھر آئیں۔ صرف دو دن بعد ان کی روانگی تھی۔ جب اس کے ابو رات کو کھانے کے بعد کافی پی کر اپنے کمرے میں گئے تو کاشف کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

"کیا بات ہے؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"ابو، مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے" کاشف نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم یہیں رہ جائیں؟"

"یہاں رہ جائیں، کیا مطلب؟" ابو حیران رہ گئے۔

"میرا مطلب ہے ہمیشہ کے لیے یہاں آجائیں" اس نے کہا۔

"مگر یہ تو ایک غریب اور گندہ ملک ہے۔ تمھارے لیے یہاں دل چسپی کی کوئی چیز نہیں" ابو نے اس کے کہے ہوئے الفاظ دُہرا دیے۔

"نہیں، ابو" اُس نے شرمندگی سے کہا "پاکستان بہت اچھا ہے۔ بہت خوبصورت، بہت حسین ہے۔ یہاں سب کچھ ہے، پیار، محبت خلوص۔"

"بیٹے، میرے بس میں ہوتا تو میں یہاں آجاتا۔ مگر تمھیں پتا ہے کہ فی الحال یہاں آنا ممکن نہیں۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر کوشش کروں گا کہ ہر سال یہاں آیا کریں۔"

جب وہ رُخصت ہو رہے تھے تو سب لوگ اُداس تھے خاص طور پر دادا ابا اور دادی اماں تو بہت چُپ چُپ اور افسردہ سے تھے۔ کاشف کو بھی نہ جانے کیوں افسوس سا ہو رہا تھا۔ دادا ابا نے جب اُسے گلے لگایا تو اُن کے سینے کی گرمی اُس کے دِل میں اُترنے لگی۔ دادی اماں نے اُسے گلے لگایا تو اُن کے آنسو نکل آئے۔ باری باری سب نے اسے گلے لگایا اور پیار کیا۔ وہ چُپ چاپ کھڑا تھا۔ اُس کا جی یہاں سے جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

اور جب وہ جہاز کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اُس کا سر فخر سے بلند تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، میرا تعلق پاکستان سے ہے جو ایک غریب ملک ضرور ہے مگر اس کی اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنا تمدن، اپنا کلچر، اپنا ماضی ہے۔ میں پہلے ایک کنویں کے مینڈک کی طرح تھا جو صرف سوئٹزرلینڈ کو ہی سب کچھ سمجھتا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا ہے کہ پاکستان سوئٹزرلینڈ سے کہیں اچھا اور پیارا ہے۔

جہاز کے اندر داخل ہونے سے پہلے اُس نے آخری مرتبہ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں اس سرزمین کے لیے عقیدت، احترام اور محبت تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی ساری محبتیں اسے اور کہاں مل سکیں گی۔

روشنی کا سفر

محمد اقبال ثاقب

آج سے لاکھوں سال پہلے ، دنیا میں سُورج اور چاند کی روشنی کے علاوہ کسی دوسری روشنی کا تصور تک نہیں تھا ۔ سورج غروب ہونے کے بعد پوری دُنیا تاریکی میں ڈوب جاتی تھی ۔ روشنی کے بغیر قدیم انسان کے گھر تاریک اور زندگی بے مزہ تھی ۔ تقریباً 50 ہزار سال پہلے اِنسان نے آگ جلانا سیکھ لیا اور یہ آگ روشنی کا ابتدائی مصنوعی ذریعہ ثابت ہوئی ۔

20 ہزار سال پہلے جب قدیم انسان نے غاروں کی دیواروں پر حیرت انگیز تصاویر بنائیں تو اُن فنکاروں نے اپنی تصویروں کی نمائش کے لیے آگ کی روشنی کو استعمال کیا ۔ وہ یقیناً غاروں کو روشن کرنے کے لیے جنگل سے کوئی جلتی ہوئی لکڑی لائے ہونگے اور تاریک جگہوں کو روشن کیا ہوگا ۔ اِسی روشنی کی وجہ سے آدمی نے اب غاروں کو گھروں کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ۔ یہ گھر اُن کے لیے نسبتاً زیادہ بہتر تھے ۔ کیونکہ وہ اِن میں جنگلی جانوروں اور موسموں کی شِدت سے زیادہ محفوظ تھے ۔

ہزاروں سالوں تک آدمی آگ کے شُعلوں سے روشنی حاصل کرتا رہا ۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی کے یہ شُعلے لکڑی کے علاوہ چربی ، تیل اور موم بتّی سے بھی حاصل کیے جانے لگے ۔

گذشتہ 200 سالوں میں تیز روشنیاں گیس اور بجلی سے حاصل کی گئیں ۔ برقی روشنی کی ایجاد نے باقی تمام روشنیوں پر فوقیت حاصل کر لی ۔ سب سے پہلے 1800 ء میں "ڈے وی" (Davy) نے بجلی کا ایک "آرک لمپ" (Arc Lamp) ایجاد کیا جو تقریباً 50 سال تک استعمال ہوتا رہا ۔ اِس کے بعد 1841 ء میں "ایڈیسن" اور "سوان" دونوں نے ایک ایسا بلب ایجاد کیا جس میں کاربن کی ایک باریک سی تار بجلی سے روشن ہوتی تھی ۔ اس تار کو "فِلامنٹ" کہتے ہیں ۔ بعد میں "فِلامنٹ" بنانے کے لیے کاربن کی بجائے ایک اور دھات "ٹنگسٹن" (Tungsten) استعمال کی گئی ۔ اِن برقی بلبوں کے بعد 1920 میں شیشے کی ایسی ٹیوب ایجاد کی گئی جس میں ایک کم دباؤ والی گیس میں سے بجلی کا کرنٹ گزار کر روشنی حاصل کی گئی ۔ یہ بلب اور ٹیوبیں آج کل ہمارے ہاں کثرت سے استعمال ہو رہی ہیں ۔

ان روشنیوں کی ایجاد سے انسان کی زندگی بہت محفوظ ہو گئی ہے ۔ اب وہ رات کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے سے بچ گیا ہے اور دِن رات کام کر کے زیادہ ترقی کرنے کے قابل ہوگیا ہے ۔

دُنیا کا پہلا چراغ جانور کی کھوپڑی سے بنایا گیا ۔ کھوپڑی کو چربی سے بھرا گیا اور بتّی کے لیے درختوں کے ریشوں کو استعمال کیا گیا ۔

بعد میں کھوپڑی کی جگہ پتّھر کو درمیان سے کھوکھلا کر کے پیالہ بنایا گیا ۔ پتّھر کے یہ چراغ تقریباً 20,000 سال پہلے بنائے گئے ۔

قدیم زمانے میں جلتی لکڑیوں کو مشعل کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا ۔ لیکن بعد میں درختوں کی گوند اور جانوروں کی چربی سے مشعلیں بنائی گئیں ۔

مٹّی کے چراغ تقریباً ۹۰۰ سال قبل مسیح میں بنائے گئے ۔ اِن چراغوں کی بتّی درمیان میں ہوتی تھی اور ایسے چراغ عام استعمال ہوتے تھے ۔

تقریباً دو ہزار سال پہلے تیل کے چراغ اور سرکنڈے کی موم بتّی بنائی گئی ۔ سرکنڈے کی موم بتّی ، سرکنڈے کو چھیل کر اور اُسکے گودے کو موم میں ڈبو کر بنائی جاتی تھی ۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں گیس کی روشنی سامنے آئی ۔ یہ روشنی گیس کو ایک چھوٹے سے سوراخ پر جلا کر حاصل کی گئی اور شُعلے کے ارد گرد شیشہ لگایا گیا ۔

معدنی تیل کی دریافت کے بعد امریکہ میں ۱۹ ویں صدی کے وسط میں مٹّی کے تیل کے چراغ بنائے گئے ۔ اِن کی روشنی قدرے تیز اور صاف تھی ۔

1800ء میں "ڈے وی" نے پہلی مرتبہ برقی "آرک لمپ" ایجاد کیا۔ اُس کی روشنی بہت تیز تھی اور یہ لمپ ۱۹ ویں صدی کے وسط تک استعمال ہوتا رہا۔

1880ء میں گیس کی روشنی کو "مینٹل" کی ایجاد نے بہتر بنا دیا۔ یہ "مینٹل" ایک دھات سے جالی کی شکل میں بنایا گیا۔ یہ حرارت سے سفید ہو جاتا ہے۔

1941ء میں "سوان" اور "ایڈیسن" نے "فِلامنٹ لمپ" ایجاد کر لیے۔ یہ "فِلامنٹ" کاربن کی باریک تار سے بنایا گیا۔
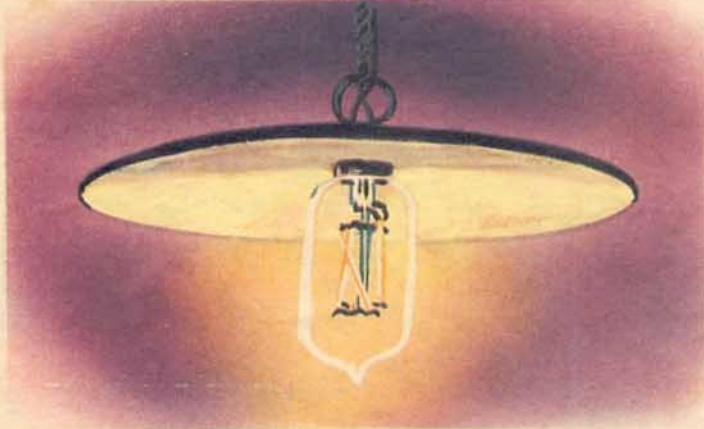
کاربن "فِلامنٹ" کی ناپائیداری کی وجہ سے "ٹنگسٹن" دھات کے "فِلامنٹ" والے برقی بلب ایجاد کیے گئے جو زیادہ دیر پا تھے۔

موجودہ بلبوں میں "ٹنگسٹن" کا "فِلامنٹ" چھوٹے سپرنگ کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور بلب کے اندر ایک غیر عامل گیس "آرگن" بھری ہوتی ہے۔
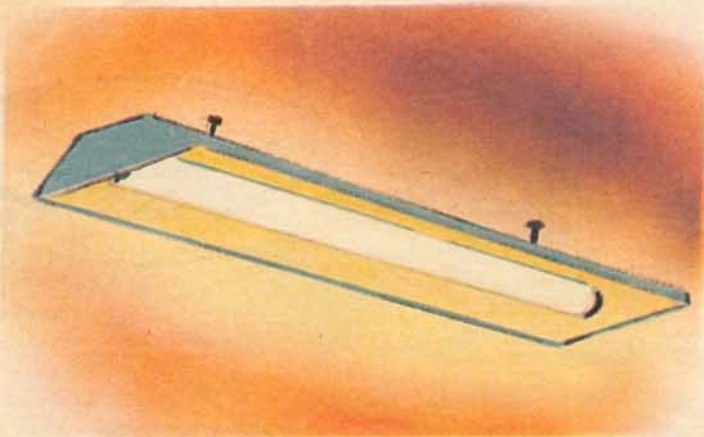
جدید "ڈِسچارج ٹیوب" کی اندرونی سطح پر ایک کیمیکل "Fluorseces" کی تہہ چڑھائی جاتی ہے۔ جو ایک گیس میں سے کرنٹ گزارنے پر چمکتی ہے۔

جادو کے کھیل

یہ بہت دِل چسپ اور حیرت انگیز چکلے (ٹرک) ہیں ۔ انہیں دیکھ کر تماشائی حیران رہ جائیں گے اور آپ کو سچ مُچ کا "جادُوگر" مان لیں گے ۔ لیکن کسی محفل میں دِکھانے سے پہلے خُوب مشق کر لیں ۔ ذرا سی غلطی سے بھانڈا پھوٹ جائے گا اور آپ کو شرمندگی اُٹھانی پڑے گی ۔

(۱)

ایک بڑا پیالہ لیجیے ۔ شیشے کا ہو تو اچھّا ہے ۔ اُس میں پانی بھریے ۔ پھر اُس کے بیچوں بیچ بوتل کا کارک ڈال دیجیے ۔ وہ تیرنے لگے گا ۔ اب تماشائیوں سے کہیے :

"صاحبان ! آپ میں سے جو شخص اِس کارک کو پانی میں ڈبو دے گا ، میں اُسے دُنیا کا سب سے عقل مند اِنسان مان لُوں گا ۔ لیکن کارک کو ہاتھ نہ لگائیں ، نہ کسی اور چیز سے چھوئیں ۔"
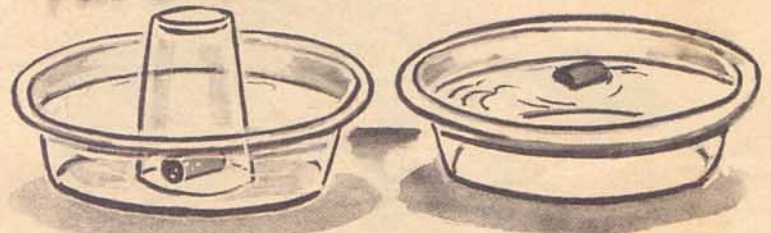
ظاہر ہے بغیر ہاتھ لگائے کارک پانی میں نہیں ڈوبے گا ۔ جب سب لوگ ہار مان لیں تو آپ کارک کو گلاس سے ڈھانپ دیں ۔ کارک (ہوا کے دباؤ سے) پانی میں ڈوب جائے گا ۔ اس بات کا خیال رکھیے کہ کارک گلاس کے بیچوں بیچ رہے ۔ اُس سے چھُونے نہ پائے ۔ ورنہ تماشائی شور مچا دیں گے ۔

(2)

ماچس کی ایک ڈِبیا لیجیے ۔ اُس کے دونوں جانب سفید کاغذ چپکا دیجیے تاکہ دونوں طرفیں ایک جیسی معلوم ہوں ۔ اب ڈِبیا میں سے تیلیاں نکال لیں اور اُس کی پُشت پر نو دس تیلیوں کی قطار لگا دیں (جیسا کہ اِس تصویر میں دِکھایا گیا ہے) ۔ دُور سے ایسا معلوم ہو گا جیسے ماچس بھری ہوئی ہے ۔ اِس ماچس کو جیب میں ڈال لیں ۔

تماشائیوں سے کچھ دور کھڑے ہوں ۔ قریب کھڑے ہوں گے تو وہ آپ کی چالاکی سمجھ جائیں گے ۔ اب جیب سے ماچس نکالیں اور انہیں اس کی وہ طرف دِکھائیں جس میں تیلیاں لگی ہوئی ہیں ۔ پھر زرو سے کہیں :

"دیکھیے صاحبان ! یہ ماچس بالکل بھری ہوئی ہے ۔ لیکن میں جادو کے زور سے اسے خالی کر دوں گا ۔"

یہ کہہ کر ماچس کو پیٹھ کے پیچھے لے جائیں اور جلدی سے اُس کا رُخ بدل دیں ۔ اب آپ تماشائیوں کو ماچس دکھائیں گے تو اُس کی خالی طرف اُن کے سامنے ہوگی ۔ وہ بہت حیران ہوں گے ۔

(3)

اس کھیل کے لیے کوٹ پہننا ضروری ہے ۔

ایک پنسل لیجیے اور اُسے اس طرح پکڑیے جس طرح تصویر (الف) میں دِکھایا گیا ہے ۔ اب تماشائیوں سے کہیے :

"دیکھیے صاحبان ! میں اس پنسل کو رُومال سے ڈھانپوں گا تو یہ غائب ہو جائے گی ۔"

یہ کہہ کر دُوسرے ہاتھ سے رُومال اُٹھائیں اور اُسے پنسل کے اُوپر ڈال دیں ۔ رُومال اتنا بڑا ہو کہ پنسل کے ساتھ ہاتھ بھی ، آستین تک چُھپ جائے (دیکھیے تصویر ب)۔

اب چند سکنڈ مُنھ ہی مُنھ میں کوئی منتر پڑھیں اور پھر ایک ، دو، تین کہہ کر پنسل کو چھوڑ دیں اور اُس کی جگہ اُنگلی کھڑی کر لیں ۔ پنسل سیدھی آستین میں چلی جائے گی ۔ مگر یہ باتیں اتنی جلدی ہونی چاہئیں کہ تماشائیوں کو احساس تک نہ ہو ۔ اس کے بعد تماشائیوں سے کہیے :

"دیکھیے صاحبان ! پنسل غائب ہوگئی ہے اور یہ اس کا بُھوت کھڑا ہے ۔ یقین نہ ہو تو یہ دیکھیے ۔"

یہ کہتے ہی پُھرتی سے اُنگلی بند کر لیں اور رُومال ہٹا دیں (تصویر ج) ۔ ہاتھ نیچا نہ کریں ورنہ پنسل آستین میں سے نکل پڑے گی ۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھ نیچے کی جیب میں ڈال لیں ۔ پنسل جیب میں آجائے گی ۔

(4)

تین گلاس اس طرح رکھیے جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے ۔ اب ماچس میں سے تین تیلیاں نکالیے اور تماشائیوں سے کہیے :

"ان تیلیوں سے گلاس پر اس طرح پُل بنائیے کہ ایک تیلی صرف ایک گلاس کو چھوئے ۔"

جب کوئی بھی ایسا پُل نہ بنا سکے تو آپ تصویر کے مطابق تینوں تیلیاں گلاسوں پر رکھ دیں ۔

(5)

یہ بھی ایک بہت دل چسپ کھیل ہے ۔

ماچس کی چھ تیلیاں میز پر رکھیے اور تماشائیوں سے کہیے :

"ان تیلیوں کو اس ترتیب سے رکھیے کہ ایک تیلی اٹھانے سے باقی تیلیاں بھی اُٹھ آئیں ۔" تماشائی بہت کوشش کریں گے مگر کام یاب نہ ہوسکیں گے ۔

اس تصویر کو غور سے دیکھیے ۔ تیلیاں اسی ترتیب سے رکھنی ہیں ۔ جب آپ سب سے نیچے والی تیلی اُٹھائیں گے تو اُس کے ساتھ باقی پانچوں تیلیاں بھی اُٹھ آئیں گی ۔ اس کھیل کے لیے کافی مشق کی ضرورت ہے ۔

عید کی سچی خوشی

رضوانہ سیّد علی

کوہ ہمالیہ کی ایک اُونچی چوٹی پر، گھنے جنگلوں میں، بھالوؤں کا ایک خاندان رہتا تھا ۔ امّی ، ابّو، خالہ، خالو اور ایک ننّھا سا بچّہ ۔ یہ سب بھالو ایک بڑے سے غار میں رہتے تھے ۔ ننّھے بھالو کو پیار سے سب گپّو کہتے تھے ۔ گپّو کی امّی نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ بیٹا، آدمی سے بچ کر رہنا ۔ نیچے پہاڑ کے دامن میں اِنسانوں کی جو بستیاں ہیں، کبھی اُن کے قریب نہ جانا ۔

گپّو سمجھدار بچّہ تھا ۔ امّی کا کہنا مانتا تھا ۔ لیکن وہ بہت بور رہتا تھا کیونکہ اس کا کوئی دوست نہ تھا ۔ اس کے امّی، ابّو اور خالہ ، خالو کو نیند بہت آتی تھی ۔ جہاں کھانے پینے سے فارغ ہوئے، بس سونے لگے ۔ گپّو بے چارہ بے زار بے زار سا رہتا ۔ کچھ دیر غار میں رہتا، پھر اُکتا کر باہر نکل کھڑا ہوتا اور خوب خوب گھومتا ۔

گھومتے پھرتے کبھی کبھار نیچے بھی اُتر جاتا ۔ بالکل اِنسانی بستیوں کے پاس۔اپنی امّی کے کہنے کے مطابق وہ بستیوں کے قریب تو نہ جاتا، مگر کسی چھوٹے سے درخت میں چُھپ کر ان کو خوب غور سے دیکھتا ۔ سر پر مٹکے رکھے، پانی بھرنے جاتی ہوئی عورتیں، بیلوں کو ہانکتے ہوئے آدمی، آنکھ مچولی کھیلتے بچّے، کُٹ کُٹ کرتی مُرغیاں اور ان کے چوزے، قیں قیں کرتی، پانی میں تیرتی بطخیں، گھوڑے اور گائیں۔یہ سب کچھ گپّو کو بہت اچّھا لگتا تھا ۔

ایک دن گپّو ٹہلتا ٹہلتا ایک گاؤں کے قریب چلاگیا ۔ اس روز اسے گاؤں میں کچھ عجیب چہل پہل سی نظر آئی ۔ ایک کُھلے میدان میں رنگ برنگ شامیانوں کے نیچے، طرح طرح کی دکانیں سجی ہوئی تھیں ۔ چوڑیاں، کھلونے اور طرح طرح کی مٹھائیاں اُن دُکانوں میں رکھی تھیں ۔ جھولے بھی لگے ہوئے تھے ۔ لوگ خوب اچھے اچھّے کپڑے پہن کر گھوم پھر رہے تھے ۔ بچّوں نے بھی پیارے پیارے کپڑے پہن رکھّے تھے، اور لڑکیاں تو بالکل گڑیاں دکھائی دیتی تھیں ۔

گپّو بہت دلچسپی سے یہ رنگین سماں دیکھ رہا تھا ۔ مگر سمجھ نہ پا رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے ؟ دراصل وہ عید کا دن تھا اور گاؤں میں عید کا میلا لگا تھا ۔ جنگل کے بالکل قریب جو مکان تھا، اس میں سے کچھ ایسی مزے مزے کی خوش بوئیں اُٹھ رہی تھیں کہ گپّو سے رہا نہ گیا ۔ وہ چُپکے چُپکے اس گھر کی طرف بڑھا ۔ نزدیک، پہنچا تو ایک کھڑکی دِکھائی دی ۔ اس نے کھڑکی کے اندر جھانکا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت ہی سجا ہوا کمرا ہے۔دسترخوان پر مزے مزے کے کھانے رکھے ہیں ۔ گھر والوں نے اچھّے اچھّے کپڑے پہن رکھّے ہیں ۔ سب خوب ہنس بول رہے ہیں ۔ جو لفظ بار بار گپّو کے کان میں پڑا، وہ تھا "عید"۔ اچانک اسے کچھ آہٹ سی سنائی دی۔وہ سرپٹ بھاگا اور پلک جھپکتے میں جنگل میں جا پہنچا ۔

کچھ دیر بعد جب وہ اپنے غار کی طرف جا رہا تھا تو یہی سوچ رہا تھا کہ یہ عید کیا ہے جس نے انسانوں کو اس قدر خوش کر رکھا ہے ۔ آخر وہ اپنے غار میں پہنچ گیا اور اپنی امّی کو اٹھانے لگا ۔

"امی، امی۔ہر وقت سوئی ہی رہتی ہیں ۔ اُٹھیے اور مجھے بتائیے کہ عید کیا ہے؟ لوگ کیوں اتنے خوش ہیں ؟ مجھے بھی عید چاہیے ۔ خوشی چاہیے"۔مگر امی توگہری نیند سو رہی تھیں ۔ جب گپّو نے انہیں خوب جھنجھوڑا، خوب شور مچایا، تب کہیں ان کی آنکھ کھلی ۔ کافی دیر تو ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا معاملہ ہے۔ اتنی دیر میں شور مچا مچا کر گپّو نے سب کو اٹھا دیا تھا ۔ سب غور کرنے لگے کہ بھئی یہ عید کیا ہے ؟ آخر خالو بولے کہ میں اس مسئلے کو حل کروں گا ۔ وہ اُٹھے اور بستی کی طرف چلے گئے ۔

کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹے تو اُن کے ہاتھ میں کھوکھلے تنے کا ایک ٹکڑا تھا جس میں شہد بھرا تھا ۔ کچھ جنگلی پھل بھی وہ توڑ لائے تھے ۔ وہ گپّو کو گود میں اُٹھا کر کہنے لگے "مجھے پتا چلا ہے کہ عید خوب مزے مزے کی چیزیں کھانے کا نام ہے ۔ تم یہ مزے مزے کی چیزیں کھاؤ اور ہمیں آرام کرنے دو ۔" گپّو خوشی سے ناچنے لگا ۔ پہلے اس نے پھل اُڑائے پھر شہد پر ہاتھ صاف کیا ۔ مگر یہ کیا ؟ جیسے ہی کھانے پینے کی چیزیں ختم ہوئیں، اُس کی ساری خوشی بھی جاتی رہی ۔ اسے پھر رونا آنے لگا ۔ وہ پھر اپنے بزرگوں کے سر پر سوار ہوگیا اور عید کا مطلب پوچھنے لگا ۔

اس مرتبہ اس کی خالہ عید کا مطلب معلوم کرنے نکلیں ۔ کچھ دیر بعد وہ ایک خوبصورت ہار لے کر لوٹیں، جس میں موتیوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے سُرخ بیر پروئے ہوئے تھے اور موتیوں سے بھی زیادہ پیارے لگ رہے تھے ۔ اس کے علاوہ تنکوں سے بنا ہوا ایک ہیٹ بھی تھا جس میں مور کا ایک پر لگا تھا ۔ خالہ نے گپّو کو بتایا کہ عید اچھے اچھے کپڑے پہننے اور بننے سنورنے کا نام ہے ۔

اتنے خوبصورت تحفے پا کر گپّو کی تو سچ مچ عید ہو گئی ۔ اُس نے ہیٹ سر پر رکھا، مالا گلے میں پہنی اور خوب اُچھلا کُودا۔مالا کے دانے جب اُچھل اُچھل کر اس کے پیٹ سے ٹکراتے تو وہ خوب قہقہے لگاتا۔ لیکن ابھی گھنٹا بھی نہ گزرا تھا کہ وہ اس کھیل سے اُکتا گیا ۔ غار میں جا کر دیکھا تو سب خراٹے لے رہے تھے ۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔وہ کہہ رہا تھا کہ عید کا مطلب صرف کھانا اور پہنا نہیں بلکہ کچھ اور ہے ۔ میں اس طرح خوش ہونا چاہتا ہوں جیسے گاؤں کے لوگ تھے ۔ مجھے بتائیں ، آخر عید کیا ہے؟ میں گاؤں کے لوگوں کی طرح خوش ہونا چاہتا ہوں ۔ آخر اُسکی امی اٹھیں اور نیچے بستی کی طرف روانہ ہو گئیں ۔ جب وہ واپس لوٹیں تو ان کے ہاتھ بالکل خالی تھے ۔

انہوں نے گپّو سے کہا کہ میرے بچّے میں نے عید کا مطلب پا لیا ہے ۔ عید کی سچّی خوشی دوسروں کو خوش کرنے میں ہے ۔

"عید کی سچی خوشی دوسروں کو خوش کرنے میں ہے"
گپّو نے دُہرایا اور کچھ دیر غور کرتا رہا کہ دوسروں کو کیسے خوش کیا جا سکتا ہے ؟ پھر وہ غار سے باہر نکل گیا ۔
کافی دیر بعد وہ واپس آیا تو سب گھر والے جاگ چکے تھے اور اب کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔گپّو مختلف چیزوں سے لدا پھندا تھا ۔ اس نے اپنی خالہ کو ایک خوبصورت ٹوکری پیش کی جو پرندوں کے رنگ برنگ پروں سے سجی ہوئی تھی ۔ اس کی خالہ خوبصورت چیزیں بہت پسند کرتی تھیں ۔ وہ خوشی سے چلّا اٹھیں"ہائے گپّو۔کتنی پیاری ٹوکری ہے ! اب میں اسے لے کر شاپنگ کرنے جایا کروں گی ۔"
گپّو نے اپنے خالو کو اخروٹوں سے بھرا ایک تھیلا پیش کیا کیونکہ وہ میوہ بہت شوق سے کھاتے تھے ۔ وہ اپنے ابّو کے لیے ایک مضبوط چھڑی لایا تھا تاکہ اونچے پہاڑوں پر چڑھیں تو چھڑی کا سہارا لے لیں ۔ اور امّی کے لیے وہ ایک جھاڑو لایا تھا، کیونکہ غار کی صفائی سُتھرائی امّی کے ذمّے تھی ۔
سب لوگ اپنے تحفے پا کر بے حد خُوش تھے اور انہیں خوش دیکھ کر گپّو بھی خوشی سے جُھوم رہا تھا۔اب اس نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ عید کی سچّی خوشی دوسروں کو خوش کرنے میں ہے ۔

ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

رسولِ کریم حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اپنی تعلیمات کا عملی نمونہ تھے ۔ جو کچھ آپؐ ارشاد فرماتے ، اُس پر خُود بھی عمل فرماتے ۔ حضرت علیؓ نے ایک دفعہ حضورؐ کے اخلاق و عادات کے متعلّق فرمایا : "آپ نرم مزاج، ہنس مُکھ ، مہربان اور رحم دِل تھے ۔ سخت مزاج اور تنگ دِل نہیں تھے ۔ کوئی بُرا کلمہ مُنہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے لوگوں کے عیب تلاش نہیں کرتے تھے ۔ کوئی ایسی بات ہو جاتی جو آپؐ کو ناپسند ہوتی تو اُس سے چشم پوشی فرماتے ۔ آپؐ کسی کو بُرا نہیں کہتے تھے ۔ کسی کے اندرونی حالات کی تلاش میں نہیں رہتے تھے ۔ لوگوں کے عیب نہیں نکالتے تھے ۔ وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکلتا ہو ۔ کوئی اجنبی اور ان پڑھ آدمی اگر بیباکی سے گفتگو کرتا تو تحمّل اور برداشت سے کام لیتے ۔ آپؐ دوسروں کے مُنہ سے اپنی تعریف سُننا پسند نہیں کرتے تھے ۔ لیکن اگر کوئی آپؐ کے احسان کا شُکریہ ادا کرتا تو اُسے قبول فرما لیتے ۔ جب تک بولنے والا خُود چُپ نہ ہو جاتا ، آپؐ اُس کی بات درمیان سے نہ کاٹتے ۔ آپ نہایت فیّاض ، نہایت سچّے ، نہایت شیریں مزاج اور خُوش گُفتار تھے ۔ اگر کوئی اچانک آپؐ کو دیکھتا تو آپؐ سے مُتاثّر ہو جاتا اور جیسے جیسے آپؐ کے قریب ہوتا جاتا، آپؐ سے محبت کرنے لگتا ۔"
حضُور مہمان نوازی میں بُہت مشہور تھے ۔ آپؐ کے ہاں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم مہمان بھی ٹھہرتے تھے ۔ آپؐ سب کی کُھلے دِل سے تواضُع کرتے ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گھر میں جو کچھ ہوتا، مہمان کو کِھلا دیتے اور خُود فاقہ کرتے ۔
آپؐ لین دین کے معاملوں میں آئینے سے بھی زیادہ شفّاف تھے ۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے"سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض اچھّی طرح ادا کرتے ۔ ایک بار آپؐ نے کسی سے اُونٹ قرض لیا ۔ جب واپس کیا تو وہ اُونٹ اُس سے بہتر تھا ۔
آپؐ نہ تو خُشک مزاج تھے اور نہ آپؐ کو رُوکھا پن پسند تھا ۔ آپؐ کبھی کبھی بہت دلچسپ باتیں فرماتے۔ ایک بار ایک بُڑھیا آپؐ کی خدمت میں حاضِر ہوئی اور عرض کیا "یا رسول اللہ ! میرے لیے دُعا فرما دیں کہ مجھے بہشت نصیب ہو"۔ آپؐ نے فرمایا "بُڑھیاں جنّت میں نہیں جائیں گی ۔" یہ سُن کر وہ رونے لگی اور واپس چلی گئی ۔ آپؐ نے حاضرین سے فرمایا کہ اس سے کہہ دو کہ "بُڑھیاں جنّت میں جوان ہو کر جائیں گی ۔"
آپؐ بچّوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے ۔ سفر سے واپس تشریف لاتے تو راستے میں جو بچّے ملتے اُن کو اپنی سواری پر بیٹھا لیتے اور راستے میں بچّوں کو خود سلام کرتے ۔
حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ فرماتے تھے کہ میں نماز اِس ارادے سے شروع کرتا ہوں کہ دیر سے ختم کروں گا ۔ لیکن جب صف سے کسی بچّے کے رونے کی آواز آتی ہے تو میں نماز کو مُختصر کر دیتا ہوں تاکہ اِس کی ماں کو تکلیف نہ ہو ۔

عید مبارک

اِس مہینے کی سات یا آٹھ تاریخ کو عیدُ الفِطر ہے۔ مُسلمان یہ عید رَمَضان کے روزے پُورے ہونے کی خوشی میں مناتے ہیں۔ اس روز آپ کو چاہیے کہ صُبح سویرے اُٹھ کر غُسل کریں۔ نئے کپڑے پہنیں اور نماز پڑھنے جامع مسجد یا عید گاہ جائیں۔ عید گاہ جانے سے پہلے کھجُوریں یا کوئی میٹھی چیز کھانا اچّھا ہے۔

اِس دِن مُسلمان خُدا کی راہ میں صدقۂ فِطر دیتے ہیں۔ صدقہ دینا ہر اُس مسلمان پر لازِم ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونا ہو۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ گھر کے ہر فرد کے بدلے دو سیر گیہُوں یا اِن کی قیمت کسی غریب آدمی کو دے۔ صدقۂ فِطر نماز عید سے پہلے دینا بہتر ہے۔ لیکن نماز کے بعد بھی دیا جاسکتا ہے۔

جب آپ عید گاہ جائیں تو راستے میں بلند آواز سے یہ تکبیر پڑھیں:
اَللّٰہُ اَکبَر اَللّٰہُ اَکبَر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکبَر اللّٰہ اَکبَر و لِلّٰہِ الحَمد (اللہ بہُت بڑا ہے۔ اللہ بہُت بڑا ہے۔ اللہ کے سِوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اللہ بہُت بڑا ہے۔ اللہ بہُت بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں)۔

عیدگاہ یا جامع مسجد پہنچ کر جہاں جگہ مِلے، بیٹھ جائیں اور جب نماز شرُوع ہو تو یہ نیّت کریں: "میں دو رکعت عید کی واجِب نماز، چھ تکبیروں کے ساتھ، پڑھتا ہُوں"۔ پھر امام کے ساتھ اَللّٰہُ اَکبَر کہ کر ہاتھ باندھ لیجیے اور سُبحٰنَکَ اللّٰھُمَّ پڑھیے۔ اِس کے بعد خاموش ہو جائیے۔ جب اِمام تکبیر کہے تو آپ بھی تکبیر کہیے۔ پہلی تکبیر کے ساتھ کانوں تک دونوں ہاتھ اُٹھا کر اَللّٰہُ اَکبَر کہیے اور ہاتھ چھوڑ دیجیے۔ پھر ہاتھ اُٹھا کر اَللّٰہُ اَکبَر کہیے اور ہاتھ چھوڑ دیجیے۔ اِس کے بعد ہاتھ اُٹھا کر اَللّٰہ اَکبَر کہیے اور ہاتھ باندھ لیجیے۔ اب اِمام صاحب اَلحَمد اور سُورۃ پڑھ کر رکُوع اور سجدہ کریں گے۔ آپ بھی اُن کے ساتھ رکُوع اور سجدہ کیجیے۔

دُوسری رکعت میں اِمام صاحب اَلحَمد اور سُورۃ پڑھیں گے اور تکبیر کہیں گے۔ پہلی تکبیر میں آپ، اِمام صاحب کے ساتھ، ہاتھ اُٹھا کر چھوڑ دیجیے۔ دُوسری اور تیسری تکبیر میں بھی ایسا ہی کیجیے۔ لیکن چوتھی تکبیر کے ساتھ، بغیر ہاتھ اُٹھائے، اَللّٰہ اَکبَر کہ کر رکُوع میں چلے جائیے اور نماز پُوری کیجیے۔

نماز کے بعد امام صاحب دو خطبے پڑھیں گے، جن کا سُننا اِتنا ہی ضرُوری ہے جِتنا نماز پڑھنا۔ اِس لیے اُنھیں نہایت خاموشی اور اِطمینان سے سُنیے۔ خُطبے کے بعد اُس راستے سے گھر واپس نہ جائیے جس راستے سے آئے تھے۔ کوئی دُوسرا راستہ اِختیار کیجیے۔ ایسا کرنا سُنّت ہے۔

نماز پڑھ کر دوستوں اور عزیزوں کو عید کی مُبارک باد دینا اور گلے مِلنا بھی سُنّت ہے۔ خُوشی منانا، میلے میں جانا اور دوستوں کو عید کارڈ بھیجنا اچھا ہے۔ لیکن ان کاموں میں فضُول خرچی نہیں کرنا چاہیے۔

پاک وطن

تاج انصاری

چاند سا پاک وطن ہے میرا
جیسے سُورج کا ہو سویرا

نہریں ہیں جنّت کا منظر
جب جب چمکیں تارے امبر

دُور ہیں غم سب، دُور اندھیرا
چاند سا پاک وطن ہے میرا

صحرا، پربت گاتے ہیں سب
جھوم کے بادل آتے ہیں جب

خوشیوں نے ڈالا ہے ڈیرا
چاند سا پاک وطن ہے میرا

پھُول کھِلے ہیں ڈالی ڈالی
قائد ہے اِس باغ کا مالی

دشمن کا ہو دُور بسیرا
چاند سا پاک وطن ہے میرا

10

قبرستان کا سانپ

اے حمید

ناگن نے اِنسانی شکل میں آتے ہی چاروں طرف دیکھا۔

وُہ اِس لیے اِنسانی شکل میں آگئی تھی کہ اِس طرح سے وہ اچھی طرح سے حالات کا جائزہ لے سکتی تھی اور غور کر سکتی تھی۔ پھر اُس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ تہ خانے میں بالکل اکیلی ہے۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ دوسرے کمرے میں کمپیوٹر ٹیلی وژن کی سکرین پر اِس کی ایک ایک حرکت کو دیکھا جا رہا ہے۔

اچانک چھوٹے سے بند کمرے میں اِنسپکٹر کی آواز بلند ہُوئی :

"تُمھارا راز فاش ہو چُکا ہے۔ تُمھارے لیے اب یہی بہتر ہے کہ تم اس گروہ کے بارے میں بتا دو جس کے آدمیوں نے جہاز اِغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔"

یہ آواز دیوار کے ایک سپیکر میں سے آ رہی تھی۔ ناگن راگنی نے دیوار کی طرف دیکھا اور بولی "میرا کسی گروہ سے تعلق نہیں ہے۔ میں نے تو تُمھارے جہاز کو اغوا ہونے سے بچایا ہے۔ اُلٹا تُم نے مجھے گرفتار کر لیا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے ؟"

اِنسپکٹر کی آواز آئی "تو پھر وُہ ہائی جیکر کہاں اور کیسے فرار ہو گیا جس نے نقاب پہن رکھا تھا ؟"

ناگن راگنی نے کہا "میں اس کے بارے میں تُمھیں کچھ نہیں بتا سکتی۔"

اِنسپکٹر کی آواز آئی "جب تک تُم ہمیں اُس نقاب پوش کے بارے میں نہیں بتاؤ گی کہ وہ کون تھا اور وہ کہاں چلا گیا تب تک تُم اسی جگہ قید رہو گی۔ یاد رکھو یہ فولادی تہ خانہ ہے اور یہاں سے کوئی ہاتھی بھی دروازہ توڑ کر باہر نہیں نکل سکتا۔"

ناگن راگنی نے غُصّے سے پھُنکارتے ہُوئے کہا "تُم احسان فراموش لوگ ہو۔ بجائے میرا شکریہ ادا کرنے کے میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ یاد رکھو! تُم مجھے زیادہ دیر تک یہاں قید نہ رکھ سکو گے اور بہت جلد تُمھیں پچھتانا پڑے گا۔"

اِنسپکٹر کی آواز آئی "میں نے تُمھیں اپنا فیصلہ سُنا دیا ہے۔ یا تو نقاب پوش ہائی جیکر اور اُس کے جرائم پیشہ گروہ کا پتا بتا دو، یا پھر اِسی فولادی کوٹھڑی میں بھُوکی پیاسی مر جاؤ۔ ہم جانتے ہیں کہ تُمھارے پاس کوئی جادُو ہے جس کی مدد سے تُم عورت سے سانپ بن جاتی ہو۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تُمھارے پاس ایسا کوئی طلسم نہیں ہے جو تُمھیں فولاد کی دیواروں والے اِس تہ خانے سے باہر نِکال سکے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ میں تُمھیں ایک گھنٹے کی مُہلت دیتا ہُوں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر نے مائیکروفون بند کر دیا۔ جاسُوس مہدی اُس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ دونوں کی نظریں کمپیوٹر ٹی وی کی سکرین پر لگی تھیں۔ انھوں نے کمپیوٹر ٹی وی کو بند نہیں کیا تھا۔ وہ سانپ عورت کی مسلسل نگرانی کرنا چاہتے تھے۔ انسپکٹر نے جاسُوس مہدی سے کہا :

"مُصیبت یہ ہے کہ ہم اِس پر سختی بھی نہیں کر سکتے۔ اسے مارا پیٹا گیا تو عورت سے سانپ بن کر کسی کو بھی ڈس سکتی ہے۔ ہم اسے ہلاک بھی نہیں کرنا چاہتے۔ اگر یہ مر گئی تو ہمیں یہ کبھی نہ معلوم ہو سکے گا کہ ہائی جیکروں کے گروہ میں کون کون لوگ شامل ہیں۔"

جاسُوس مہدی بڑے غور سے ٹیلی وژن سکرین پر ناگن راگنی کو دیکھ رہا

تھا۔ ناگن راگنی فولادی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سر جُھکائے خاموش بیٹھی سوچ میں گم تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ شیش ناگ کا مہرہ کیوں نہیں لائی۔ اگر اس وقت مہرہ اُس کے پاس ہوتا تو وہ اُسے مُنھ میں رکھ کر ایک سیکنڈ میں غائب ہو کر وہاں سے فرار ہو سکتی تھی۔ شیش ناگ کے مُہرے کے بغیر وہ غائب نہیں ہو سکتی تھی اور غائب ہُوئے بغیر اس فولادی تہ خانے سے فرار ہونا ابھی اسے ناممکن دِکھائی دے رہا تھا۔ کامران کا کالا کراماتی نقاب اس نے قمیص کے اندر چُھپا رکھا تھا۔ جب وُہ سانپ بن جاتی تھی تو اس کے لباس کے ساتھ ہی پُراسرار نقاب بھی چھوٹے چھوٹے ایٹم یعنی ذرات کی شکل میں اُس کے جسم کے ساتھ چپک جاتا تھا۔

دُوسرے کمرے میں کمپیوٹر سکرین کے سامنے بیٹھے جاسُوس مہدی نے انسپکٹر سے کہا "اِنسپکٹر مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنی بھولی بھالی لڑکی سانپ بھی بن جاتی ہے۔ کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے؟"

اِنسپکٹر نے کہا "زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر اِنسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"

اِسی طرح باتیں کرتے کرتے جب ایک گھنٹا گزر گیا تو اِنسپکٹر نے مائیکروفون کھول دیا اور فولادی تہ خانے میں اُس کی آواز بلند ہُوئی:

"راگنی! ایک گھنٹے کی مُہلت ختم ہو گئی ہے۔ تُم نے کیا فیصلہ کیا؟"

ناگن راگنی کو سخت غصّہ آ رہا تھا۔ آج تک کسی نے اسے یُوں بےبسی سے قید نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ان پولیس والوں نے اسے سانپ سے عورت بنتے دیکھ لیا ہے اور اب اس کا سانپ بننے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اُس نے کہا:

"میں کسی گروہ کو نہیں جانتی۔ میں کسی نقاب پوش ہائی جیکر کو بھی نہیں جانتی۔"

راگنی انھیں کامران نقاب پوش کے بارے ہرگز نہیں بتانا چاہتی تھی اور شیطانی مُردے کے بارے میں بھی بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کیونکہ یہ لوگ اسے کبھی اپنی گرفت میں نہیں کر سکتے تھے۔ اَنسپکٹر کی آواز آئی:

"ایک بار پھر غور کر لو۔"

ناگن راگنی نے غصّے میں بھری ہُوئی آواز میں پُھنکار کر کہا "مجھے جو کہنا تھا، کہ دیا۔ اب تُمھیں جو کُچھ کرنا ہے، کر کے دیکھ لو۔ میں تُمھیں ایک بار پھر خبردار کرنا چاہتی ہُوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تُم لوگوں کو بعد میں پچھتانا پڑے!"

انسپکٹر نے جھنجلا کر کہا "تو پھر ٹھیک ہے۔ اِس تہ خانے میں بھُوکی پیاسی مر جاؤ۔"

ناگن راگنی دِل میں ہنس دی۔ ان لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ وُہ پیاسی ایک ہزار سال تک زندہ رہ سکتی تھی۔ اِس وقت صُبح ہونے والی تھی۔ انسپکٹر نے کمپیوٹر ٹی وی کو بند کر دیا اور ٹھنڈا سانس بھر کر بولا:

"مہدی، تُم بڑے نامی گرامی جاسُوس ہو۔ مجھے بتاؤ کہ اِس سِلسلے میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم اِس عورت کو بھُوکا پیاسا مارنا بھی نہیں چاہتے۔"

جاسُوس مہدی بولا "اِس شہر سے بیس میل دُور ایک گاؤں میں ایک بڑا تجربہ کار سپیرا میرا واقف ہے۔ کیوں نہ اُسے یہاں بُلایا جائے؟ ہو سکتا ہے وہ کسی طریقے سے اِس سانپ عورت پر غنُودگی طاری کر کے اِس سے وہ راز اگلوا دے جس کی ہمیں ضرُورت ہے۔"

انسپکٹر بولا "میرا خیال ہے یہ اچھی تجویز ہے۔ تُم فوراً اُس سپیرے کو یہاں لے آؤ۔ اِتنی دیر میں کُچھ آرام کر لیتا ہُوں۔ ساری رات کا جاگا ہُوا ہُوں۔"

ٹھیک ہے۔ تُم آرام کرو۔ میں سپیرے کے گاؤں جاتا ہُوں۔"

اِتنا کہ کر جاسُوس مہدی ہیڈ کوارٹر سے باہر نِکل کر اپنی خاص جیپ میں بیٹھا اور سپیرے کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اِس وقت دِن کی روشنی کراچی شہر کی سڑکوں اور عالی شان عمارتوں پر پھیل چُکی تھی۔ سپیرے کا گاؤں جاسُوس مہدی کو معلُوم تھا۔ بہُت جلد وُہ کراچی شہر کی بارونق سڑکوں سے نِکل کر ویران علاقے میں آ گیا۔ اب وہ پکّی سڑک سے ہٹ کر ایک کچّی سڑک پر جیپ چلا رہا تھا۔ آسمان پر صُبح ہی سے ہلکے ہلکے بادل چھا رہے تھے۔ جاسوس مہدی کو دُور سے سپیرے کا گاؤں نظر پڑا۔ اُس نے جیپ پتھریلے ٹیلوں کی طرف موڑ دی۔ کیونکہ سپیرے کا ایک منزلہ کچّا مکان گاؤں سے باہر زرد ٹیلوں کے پاس تھا۔

مہدی جیپ مکان کے باہر کیکر کے درخت تلے کھڑی کر کے سپیرے کے مکان میں داخل ہُوا تو اُس نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر کا دُبلا پتلا سپیرا صحن میں بیٹھا ایک سانپ سے کھیل رہا ہے۔ مہدی کو دیکھ کر سپیرے نے سانپ کو پٹاری میں بند کر دیا اور بولا:

"بابُو، کہو، آج سویرے سویرے کیسے آنا ہُوا؟"

مہدی سپیرے کے پاس ہی چوکی پر بیٹھ گیا اور بولا "لالُو، تُم سے ایک کام آن پڑا ہے۔"

سپیرے نے اپنی نسواری چمکیلی آنکھیں جھپکائیں اور کہا "بابُو، ہم نے کبھی تمھارے کام سے انکار کیا ہے؟ بولو، اِس بار کیا مُشکل پیش آگئی ہے؟"

تب مہدی نے سپیرے کو بتا دیا کہ ایک ایسی مشکوک عورت پولیس کی حراست میں ہے جو سانپ کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے۔ اِتنا سُنتے ہی سپیرے کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی۔ وہ ٹکٹکی باندھے مہدی کے چہرے کو تکنے لگا۔ مہدی کہنے لگا:

"اس عورت سے ہمیں ایک بڑا ضروری راز معلوم کرنا ہے۔ مگر وہ زبان نہیں کھولتی اور کچھ نہیں بتاتی۔"

لگتا تھا کہ سپیرا کسی دُوسری دُنیا میں چلا گیا ہے۔ جیسے وہ کچھ اور ہی سوچ رہا ہے۔ اس نے چونکتے ہُوئے کہا "تم کیا کہہ رہے تھے، بابُو؟"

مہدی نے اپنی بات کو ایک بار پھر دُہرایا تو سپیرے نے کہا "میں اُس عورت سے وہ راز کیسے اُگلوا سکتا ہُوں؟"

مہدی بولا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جب وہ عورت سانپ کی شکل اختیار کرے تو تُم کسی طریقے سے اُس کو ہپناٹائز کر کے اس سے راز معلوم کر لو۔ پولیس تمھیں بھاری انعام دے گی۔ یہ میں وعدہ کرتا ہُوں۔"

سپیرا مُسکرایا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اُس کے دِل میں کوئی اور ہی منصوبہ اور کوئی دُوسری سکیم ہے۔ وہ کہنے لگا "یہ تُم نے ٹھیک کہا، بابُو۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ اِس طریقے سے زبان کھول دے۔ ویسے تُم مجھے اُس کے پاس لے چلو۔ میں کوشش کرتا ہُوں۔"

مہدی نے سپیرے کو جیپ میں بٹھایا اور ہیڈ کوارٹر کے اس کمرے میں لے آیا جہاں انسپکٹر اب جاگ چُکا تھا اور کافی پی رہا تھا۔ جانُوس مہدی نے انسپکٹر سے سپیرے کا تعارُف کروایا اور کہا:

"انسپکٹر، یہ وُہ مشہُور و معرُوف لالُو سپیرا ہے۔ مجھے اُمّید ہے کہ کہ اب ہم اُس سانپ لڑکی سے وہ راز معلوم کر لیں گے۔"

سپیرے نے انسپکٹر کو سلام کرتے ہُوئے کہا "صاحب جی، میری اِتنی عُمر ہو گئی ہے سانپوں کو پکڑتے۔ میں نے آج تک کوئی ایسا سانپ نہیں دیکھا جو اِنسان بن سکتا ہو۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔"

اِنسپکٹر کُرسی کھینچ کر کمپیوٹر ٹی وی سکرین کے آگے بیٹھ گیا۔ اُس نے سپیرے کو بھی اپنے پاس ہی کُرسی پر بٹھا لیا اور بولا:

"ابھی تُم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ پہلے مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔"

جانُوس مہدی انسپکٹر کے ساتھ دُوسری طرف بیٹھا تھا۔ انسپکٹر نے کمپیوٹر ٹی وی کا بٹن آن کر دیا۔ سپیرے کی نسواری چمکیلی پُراسرار آنکھیں ٹی وی سکرین پر لگی تھیں جو ایک دم سے روشن ہُوئی اور اس میں ایک خُوب صُورت لڑکی کی تصویر آ گئی جو گھٹنوں پر سر رکھے دیوار سے ٹیک لگائے فولادی تہ خانے میں اُداس بیٹھی تھی۔ وہ اس سوچ میں گُم تھی کہ اِس تہ خانے سے باہر نکلنے کے لیے کون سی ترکیب اِستعمال کی جائے۔ ناگن راگنی کو یہ خبر نہیں تھی کہ دُوسرے کمرے کی ٹی وی سکرین پر اُسے دیکھا جا رہا ہے۔

اِنسپکٹر نے مائیکروفون آن نہیں کیا تھا۔ اُس نے سپیرے سے کہا "یہ ہے وُہ لڑکی جو سانپ بن جاتی ہے۔"

سپیرا بڑے غور سے ناگن رانی کو دیکھ رہا تھا۔ جاسُوس مہدی نے کہا "اب سوال یہ ہے کہ اِس لڑکی کو کیسے مجبُور کیا جائے کہ یہ سانپ کی شکل اِختیار کرے؟"

سپیرا مُسکرایا۔ اُس نے تھیلے میں سے اپنی بِین نِکالی اور بولا "کیا میری بِین کی آواز اِس لڑکی تک پُہنچ سکتی ہے؟"

انسپکٹر نے فوراً جواب دیا "کیوں نہیں۔ میں مائیکروفون کھول دیتا ہُوں۔ تُمھاری بِین کی آواز اس تک پُہنچ جائے گی۔"

سپیرا خُوش ہوکر بولا "تو کھول دو۔ مگر تُم دونوں میں سے کوئی آواز نہ نِکالے۔"

اِنسپکٹر نے مائیکروفون کھول دیا اور سپیرے کو اشارہ کِیا کہ بِین بجانا شرُوع کرو۔ سپیرے نے بِین مُنھ کے ساتھ لگائی اور اسے بجانے لگا۔

ناگن راگنی فولادی تہ خانے میں دیوار کے ساتھ لگی اپنے خیالوں میں گُم تھی کہ اچانک اسے بِین کی آواز سُنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ بِین کی آواز دیواریں سے آرہی تھی اور اِتنی تیز تھی کہ سارا تہ خانہ اِس آواز سے گُونجنے لگا تھا۔ ناگن راگنی کے جسم میں پہلے تو ایک سنسنی دوڑ گئی۔ پھر اس کی رگوں میں خُون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں تھرتھرانے لگے۔ آنکھیں اُوپر کو چڑھ گئیں۔ بِین کی آواز نے اُس پر جادُو کردیا تھا۔ اس کے بازُو اپنے آپ بلند ہُوئے۔ وہ اُٹھی اور اس نے بِین کی دُھن پر آہستہ آہستہ رقص کرنا شرُوع کردیا۔ یہ سانپ کا رقص تھا۔ وُہ سانپ کی طرح اپنے دونوں بازُوؤں کو لہراتی کبھی پیچھے ہٹتی اور کبھی یُوں اپنا چہرہ آگے لے جاکر زور سے مارتی جیسے دُشمن کو ڈس رہی ہو۔ کمپیوٹر ٹی وی سکرین پر انسپکٹر ڈولپیں اور جاسُوس مہدی یہ منظر حیرت سے کُھلی ہُوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ سپیرے کی چمکیلی نسواری آنکھیں ٹی وی سکرین پہ سانپ ڈانس ناچتی ناگن راگنی پر لگی ہُوئی تھیں۔ اُس نے بِین کی لَے تیز کردی۔ ناگن راگنی ابھی تک لڑکی کی شکل میں ہی تھی۔ جُوں ہی بِین تیز بجنے لگی اس کے جسم میں بھی تھرتھراہٹ تیز ہوگئی۔ اس نے جھُوم جھُوم کر ناچنا شرُوع کردیا۔ پھر وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ اب وہ اپنے سُنہری بالوں کو بار بار جھٹک رہی تھی۔ اچانک اس کے مُنھ سے ایک پھُنکار کی آواز نِکلی اور وہ سانپ بن گئی۔

یہ کالا سانپ، کالی ناگن تھی جس کا پھن اُٹھا ہُوا تھا۔ وُہ بِین کی آواز پر جھُوم جھُوم کر رقص کررہی تھی۔ اپنا پھن بار بار دیوار کی طرف لے جاتی اور جہاں سپیکر سے بِین کی آواز آرہی تھی وہاں زور سے ڈستی۔ اس کے مُنھ سے پھُنکار نِکلتی اور وہ غُصّے سے پھر پیچھے ہٹ جاتی۔ سپیرے نے بِین کی لَے آہستہ کردی۔ ناگن کا ناچ بھی مدھم ہوگیا۔ پھر سپیرے نے بِین بجانی بند کردی۔ ناگن سانپ فرش پر بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ سپیرے نے ناگن پر نظریں جما رکھی تھیں۔ انسپکٹر نے کہا:

"لالُو، اب تمھیں یقین آگیا ہوگا کہ یہ لڑکی سانپ ہے۔ ویسے تُم نے کمال کردیا کہ لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر سانپ بننے پر مجبُور کردیا۔"

مہدی بولا "لالُو بڑا تجربے کار سپیرا ہے، انسپکٹر۔"

انسپکٹر نے پُوچھا "اب اِس ناگن سانپ سے تُم ہمارا راز کِس طرح اُگلواؤ گے؟ کیوں کہ اِسی لیے ہم نے تمھیں یہاں بُلوایا ہے۔"

مہدی نے اِنسپکٹر کی بات کی تائید کرتے ہُوئے کہا "ہاں، لالُو۔ تُم نے اِسے ہپنا ٹائز کردیا ہے۔ مگر یہ زبان کِس طرح کھولے گی؟ یہ تو سانپ ہے۔ ہم تو چاہتے تھے کہ تُم لڑکی کی شکل میں ہی اِس سے ہائی جیکروں کے گروہ کے بارے میں پُوچھتے۔"

لالُو سپیرے نے کِسی خاص مقصد کے لیے ناگن راگنی کو سانپ کی شکل میں لاکر بے ہوش کیا تھا۔ وہ اِتنا احمق نہیں تھا کہ ایک ایسی لڑکی کو ہاتھ سے گنوا دیتا جو سانپ بن سکتی ہے۔ اُس نے ایک خاص منتر اپنی بِین کی آواز کے ساتھ ہی پھُونک دیا تھا جِس کے اثر سے نہ صرف یہ کہ

ناگن رانی سانپ بن گئی تھی بلکہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اُس نے انسپکٹر سے کہا:

"بابُو صاحب، یہ کام اِتنا آسان نہیں ہے جتنا تُم سمجھ رہے ہو۔ میں اس سے آپ کا راز ضرور اُگلواؤں گا۔ لیکن اس کے لیے مجھے ایک خاص چِلّہ کرنا ہو گا۔"

اِنسپکٹر نے پُوچھا "پھر کیا ہو گا؟"

عیار سپیرے نے کہا "پھر یہ ہو گا کہ یہ سانپ دوبارہ لڑکی کی شکل میں آجائے گا۔ اس پر میرے منتروں کا اثر ہو گا اور اس سے جو پُوچھوں گا یہ فوراً بتانا شرُوع کر دے گی۔"

مہدی نے جلدی سے کہا "تو پھر وُہ چِلّہ شرُوع کر دو۔ ہم تُمھیں مُنہ مانگا اِنعام دیں گے۔"

سپیرے نے کہا "یہ ایک خاص چِلّہ ہے اور اِس کے لیے مجھے اس بے ہوش سانپ کو مٹّی کے کُجّے میں ڈال کر رات بھر اپنے مکان کی چھت پر کُھلے آسمان تلے رکھنا ہو گا۔ میں اس کے گرد دائرہ کھینچ کر ساری رات منتر پڑھوں گا۔ پھر جب سُورج نِکلنے والا ہو گا تو یہ سانپ اپنے آپ مٹّی کے کُجّے سے باہر آجائے گا۔ تب میں بین بجانی شرُوع کروں گا۔ سانپ ناچنے لگے گا اور پھر لڑکی بن جائے گا۔ وُہ لڑکی میری غلام ہو گی۔ میں اُسے آپ کے حوالے کر دوں گا۔ آپ اس سے جو پُوچھیں گے، سچ سچ بتائے گی۔"

اِنسپکٹر نے کہا "تو پھر تُم ابھی اِس سانپ کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور رات بھر اس پر منتر پڑھو۔ ہم صُبح آکر تُم سے اسے واپس لڑکی کی شکل میں لے جائیں گے۔"

عیار سپیرا یہی چاہتا تھا کہ کِسی طرح وہ اس ناگن سانپ لڑکی کو وہاں سے نِکال کر لے جائے۔ انسپکٹر نے اپنے آپ اس کا راستہ صاف کر دیا تھا۔ اِسی وقت ناگن سانپ کو فولادی تہ خانے سے نکال کر سپیرے کے حوالے کر دیا گیا۔ سانپ ناگن بے ہوش تھی۔ سپیرے نے اسے پٹاری میں بند کر دیا اور جاسُوس مہدی سے کہا:

"بابُو، اب مجھے میرے ڈیرے پر پُہنچا دو۔ اور ہاں، آپ لوگ اِس کا ذِکر کِسی سے نہ کریں۔"

اِنسپکٹر بولا "یہ بات تو ہم تُم سے کہنے والے تھے کہ تُم اُس کا ذِکر کِسی سے نہ کرنا۔ یہ ہمارا خاص راز ہے۔ اچھا، خُدا حافظ۔ ویسے، کیا تُمھیں یقین ہے کہ یہ سانپ دوبارہ لڑکی بن جائے گا اور لڑکی ہمارے سوالوں کے جواب دے گی؟"

سپیرے نے کہا "اگر میں نے لڑکی سے سانپ بنا دیا ہے تو میں اسے سانپ سے لڑکی بننے پر بھی مجبُور کر سکتا ہُوں۔ آپ بے فِکر رہیں، بابُو کل صُبح آکر اپنی امانت لے جائیں۔"

یہ کہ کر سپیرا مہدی کے ساتھ جیپ میں سوار ہُوا اور جیپ اُس کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ڈیرے پر پُہنچ کر سپیرے نے جاسُوس مہدی کو واپس بھیج دیا اور خود سانپ ناگن کی پٹاری لے کر کوٹھڑی میں گُھس گیا۔ پٹاری کو سنبھال کر چارپائی کے نیچے رکھا اور خُود مکان کی چھت پر چڑھ کر جاسُوس مہدی کی جیپ کو دیکھنے لگا جو دُور ٹیلوں میں کراچی کی طرف واپس جا رہی تھی۔ جب جیپ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو سپیرا جلدی سے نیچے آیا۔ اُس نے پٹاری اپنے جھولے میں رکھی۔ بُھنے ہُوئے چنوں کی پوٹلی جھولے میں ڈالی، بین پکڑی۔ مکان کو تالا لگایا اور ایک طرف چل پڑا۔ وہ تیز تیز چل رہا تھا۔ ناگن سانپ کی شکل میں اس کے پاس خزانے کی چابی آگئی تھی۔ اس نے اپنے اُستاد سے سُن رکھا تھا کہ اگر کِسی سپیرے کے ہاتھ ایسی عورت آجائے جو سانپ بن سکتی ہو تو وہ ایک ہی دِن میں کروڑپتی

بن سکتا ہے۔ کیوں کہ ایسا سانپ اِس کے حکم پر ایک خاص منتر پڑھنے سے اسے زمین کے اندر چھپے ہُوئے بادشاہوں کے خزانے لاکر دے سکتا ہے۔ سپیرا بے حد خُوش تھا کہ خُوش قسمتی سے ایسا سانپ اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ اب وہ موہن جودڑو کے پُرانے کھنڈروں کی طرف جارہا تھا جہاں اُسے یقین تھا کہ زمین کے اندر پُرانے زمانے کے بادشاہوں کے بے حد قیمتی خزانے دفن ہوں گے۔

اب ہم واپس کامران کی طرف چلتے ہیں۔ ناگن راگنی نے اُس کو ہدایت کی تھی کہ وُہ دُوسرے دِن صُبح کو قبرستان میں اس قبر پر آجائے جہاں وہ سانپ کی شکل میں رہتی ہے۔ وہ اُس کا کراماتی نقاب لے کر وہاں پُہنچ جائے گی۔ چُناں چہ کامران اگلے دِن شہر کے باہر والے ویران قبرستان میں پُہنچ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ ناگن راگنی شیطانی مُردوں کے ہاتھ جیکر غنڈوں سے پُراسرار کراماتی کالا نقاب ضرور واپس لے آئی ہوگی۔ وُہ اُس پُرانی قبر کے پاس آگیا جس کے اندر ناگن راگنی رہتی تھی۔ کامران کو جو منتر ناگن نے بتایا وُہ اس نے مُنہ ہی مُنہ میں پڑھا اور ناگن کو آواز دی۔ کوئی ناگن باہر نہ آئی۔

اُس نے دُوسری بار پھر آواز دی۔ اندر سے کوئی ناگن سانپ کی شکل میں باہر نہ نکلی۔ اب کامران پریشان ہُوا۔ اس نے بار بار آواز دی۔ ناگن راگنی اندر ہوتی تو باہر آتی۔

کامران نے سوچا کہ شاید وہ ابھی تک آئی نہیں ہے۔ وہ قبرستان میں وہیں چبوترے پر بیٹھ کر ناگن راگنی کا اِنتظار کرنے لگا۔ کامران دوپہر تک وہاں بیٹھا اِنتظار کرتا رہا مگر ناگن نہ آئی۔ اب اسے فکر لگی کہ کہیں وُہ کسی مُشکل میں نہ پھنس گئی ہو۔ اس نے صُبح کا اخبار پڑھ لیا تھا۔ کوئی جہاز اِغوا نہیں ہُوا تھا۔ کامران کو یہ اِطمینان تھا کہ جہاز اِغوا ہونے سے بچا لیا گیا ہے مگر خُود ناگن کہاں تھی؟ کامران نے سوچا کہ کیوں نہ یہاں قبرستان میں رہنے والے سانپ سے ناگن کے بارے پُوچھا جائے۔ ناگ نے اسے سانپ بُلانے کا منتر بتا دیا ہُوا تھا اور کامران کے جسم سے ناگ کی خُوش بُو بھی آتی تھی۔ چُناں چہ اس نے منتر پڑھ کر سانپ کو آواز دی:

"اِس قبرستان میں اگر کوئی سانپ ہے تو سامنے آئے!"

پُراسرار نقاب پوش

11

اندھیری رات کا کھنڈر

کامران کو سانپ کی آواز سُنائی دی۔

اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک زرد رنگ کا سانپ پھن اُٹھائے اُس کی طرف قبروں کے بیچ میں رینگتا چلا آرہا تھا۔ کامران کے پاس آکر اُس نے پھن جُھکا کر سلام کیا اور بولا:

"ناگ دیوتا کے بھائی کو میرا سلام! میں تمھاری کیا خدمت کر سکتا ہُوں؟"

کامران نے کہا "تم ناگن راگنی کو جانتے ہو جو اِس قبر میں رہتی ہے؟"

زرد سانپ بولا "ناگن راگنی تو ہماری رانی ہے۔ اُسے کون نہیں جانتا۔"

کامران نے کہا "میں ناگن راگنی کا دوست ہُوں۔ میں اُس سے ملنے یہاں آیا تھا۔ مگر وہ اپنی قبر میں نہیں ہے۔ کیا تُم بتا سکتے ہو کہ وہ اس وقت کہاں ہوگی؟"

زرد سانپ نے اپنا پھن چاروں طرف گُھما کر فضا کو سُونگھا۔ پھر بولا "ناگن رانی کی خُوشبُو شمال مشرق کی طرف سے آرہی ہے۔ مگر یہ خُوشبُو بہت دِھیمی ہے۔ لگتا ہے ناگن رانی شاید بے ہوش ہے۔"

کامران کا دِل دھڑک اُٹھا۔ خُدا خیر کرے! ناگن راگنی بے ہوش کیوں ہے؟ کہیں اُسے کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو۔ اُس نے جلدی سے پُوچھا "کیا تُم بتا سکتے ہو کہ ناگن راگنی بے ہوش کیوں ہے؟"

زرد سانپ بولا "ناگ دیوتا کے بھائی، یہ صرف دادا سانپ ہی بتا سکتا ہے۔"

کامران نے پُوچھا "دادا سانپ کہاں ہوگا؟ مجھے اُس کے پاس لے چلو۔"

زرد سانپ بولا "میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔ میں تُمھیں دادا سانپ کے پاس لیے چلتا ہُوں۔ وہ یہاں قریب ہی اینٹوں کے ویران بھٹے میں رہتا ہے۔"

زرد سانپ آگے آگے اور کامران پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ قبرستان سے باہر نکل کر زرد سانپ بائیں جانب بنجر زمین کی طرف ہو گیا۔ تھوڑی دُور اس ویران علاقے میں ایک ویران بھٹّا تھا جس کی چمنی گری ہُوئی تھی اور جگہ جگہ ٹُوٹی پُھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ان ڈھیروں میں رینگتا ہُوا زرد سانپ ایک چھوٹے سے غار میں آگیا اور دادا سانپ کو آواز دی۔ کامران غار میں اینٹوں پر بیٹھ گیا۔ اِتنے میں غار کے کونے میں سے ایک بُوڑھا سانپ نمُودار ہُوا۔ اِس نے پھن اُٹھا رکھا تھا اُس کے اُوپر والے ہونٹ پر سفید مُونچھیں لٹک رہی تھیں۔ آنکھوں کے اُوپر بھی سفید بال اُگ آئے تھے۔ زرد سانپ نے ادب سے اپنا سر جُھکا کر کہا:

"دادا سانپ! یہ عظیم ناگ دیوتا کا بھائی ہے۔"

دادا سانپ نے دھیمی آواز میں اپنے پھن کو ذرا سا جُھکاتے ہُوئے کہا "مجھے اِس کے جسم سے ناگ دیوتا کی خُوشبُو آگئی ہے۔ عظیم ناگ، ناگ دیوتا کے بھائی، تم یہاں کیسے آئے ہو؟ میں تُمھاری کیا خدمت کر سکتا ہُوں؟"

کامران نے کہا "دادا سانپ! ناگن راگنی کو کوئی حادثہ پیش آگیا ہے شاید۔ وہ کسی جگہ بے ہوش پڑی ہے۔ کیا تُم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں اور کس جگہ ہے؟"

دادا سانپ نے اپنا پھن چاروں طرف گھما کر فضا میں سُونگھا، پھر پھن جھکا کر جیسے مراقبے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سر اُٹھا کر بولا:

"ناگ دیوتا کے بھائی! ناگن راگنی اِس وقت موئن جودڑو کے جنوبی کھنڈر کے ایک ایسے تہ خانے میں بے ہوش پڑی ہے جہاں آج سے سات ہزار سال پہلے ایک مندر ہُوا کرتا تھا۔"

کامران نے حیرانی سے پُوچھا "دادا سانپ! اُسے وہاں کس نے بے ہوش کر رکھا ہے؟"

دادا سانپ بولا "اُسے وہاں ایک سپیرے نے قید کر رکھا ہے۔ وہ سپیرے کے منتر کی وجہ سے بے ہوش ہے۔ کھنڈر کے تہ خانے کے نیچے مندر کی دیوی کا جواہرات کا ہار دفن ہے۔ اُس ہار کی قیمت آج کے زمانے میں پچاس کروڑ رُوپے ہے۔ سپیرا ناگن رانی کی مدد سے ہزاروں فُٹ نیچے زمین میں دبا ہُوا دیوی کا قیمتی ہار نِکالنا چاہتا ہے۔ اگر ناگن راگنی نے سپیرے کے منتر کی وجہ سے بے بس ہو کر دیوی کا ہار نِکال کر اسے دے دیا تو ناگن راگنی قیامت تک کے لیے پتھر بن جائے گی۔ اُس کو مندر کی دیوی کی بد دُعا لگ جائے گی۔"

یہ سُن کر کامران کے ہوش اُڑ گئے۔ ناگن راگنی تو بڑی خوف ناک مُصیبت میں پھنس گئی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر دادا سانپ سے پُوچھا۔ دادا سانپ۔ تُم لوگ ناگن راگنی کو بچانے کے لیے کُچھ نہیں کر سکتے؟"

دادا سانپ بولا "عظیم ناگ دیوتا کے بھائی، سپیرے کے پاس بڑا زبردست منتر ہے۔ ہم اس کے آگے مجبور ہیں۔ وہ ہمیں اپنے منتر سے جلا کر بھسم کر سکتا ہے۔ میں تُمھیں جتنا بتا سکتا تھا، بتا دیا۔"

اچانک کامران کو خیال آیا کہ ناگن راگنی نے اسے اپنا ایک سُرخ مُہرہ دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر کبھی وُہ اُسے بُلانا چاہے تو مُہرے کو جسم کے ساتھ رگڑے وہ اُس کے پاس آجائے گی۔ کامران وُہ مُہرہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اُس وقت بھی مُہرہ اس کی جیب میں تھا۔ اُس نے مُہرہ نِکال کر جلدی سے اپنے جسم کے ساتھ رگڑا۔ دُوسری بار تیسری بار۔ مگر ناگن راگنی نہ آئی۔ دادا سانپ نے کہا:

"تُم ناگن رانی کا مُہرہ رگڑ رہے ہو؟ مگر ناگن پر تو سپیرے کے زبردست منتر کا اثر ہو چُکا ہے۔ وہ بے ہوش ہے۔ اُسے ہوش آبھی گیا تب بھی وہ تُمھارے پاس نہ آسکے گی۔ تُم سپیروں کے منتروں کو نہیں جانتے۔ وہ سانپوں کی مدد سے شہروں میں آگ لگا سکتے ہیں۔"

کامران نے مایُوس ہو کر ناگن کا مُہرہ اپنی جیب میں ڈال لیا اور بولا:

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں خُود اپنی دوست ناگن راگنی کی جان بچانے اور اُسے سپیرے کی قید سے نِکالنے جاؤں گا۔"

دادا سانپ نے کہا "ایک بار پھر سوچ لو۔ سپیرا کوئی بہت بڑا اور زبردست جادُوگر ہے۔ تُم پر بھی اُس کا منتر چل سکتا ہے۔"

کامران نے سینہ تان کر کہا "میرا خُدا میرے ساتھ ہے۔ میں اِن شاءاللہ ناگن راگنی کو ساتھ لے کر آؤں گا۔"

کامران نے ایک بار پھر دادا سانپ سے موئن جودڑو کے جنوبی کھنڈر کے بارے میں پُوچھا اور سارا نقشہ ذہن میں بٹھا لیا۔ اُس نے دادا سانپ کا شُکریہ ادا کیا اور ویران بھٹے کے غار سے باہر نِکل آیا۔ زرد سانپ اُس کے ساتھ ساتھ رینگ رہا تھا۔ زرد سانپ کہنے لگا:

"عظیم ناگ دیوتا کے بھائی! ہوشیار رہنا۔ وہ سپیرا بڑا خطرناک لگتا ہے جس نے ناگن رانی کو قید کر رکھا ہے۔"

کامران نے کہا "میرا خُدا میرے ساتھ ہے اور پھر موئن جودڑو میں کوئی نہ کوئی سانپ مجھے مِل جائے گا جو میری راہ نمائی کرے گا۔"

زرد سانپ بولا "سپیروں کے منتروں کے آگے سبھی سانپ گھبراتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی بھی سانپ تُمھاری مدد نہ کر سکے۔"

کامران نے کہا "جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ میں خُدا کے فضل و کرم سے ناگن راگنی کو سپیرے کی قید سے چھُڑا کر ہی لاؤں گا۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ ناگن راگنی کو مندر کی دیوی کی بد دُعا لگے اور وہ ہمیشہ کے لیے پتھر کی ہو جائے۔"

کامران نے زرد سانپ کو قبرستان میں چھوڑا اور خُود خیالوں میں گُم گھر کی طرف چل دیا۔ اس نے گھر جا کر کہا کہ کالج کی طرف سے کُچھ لڑکے موئن جودڑو کے تاریخی کھنڈر دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ جائے گا۔ چُناں چہ اسی دِن شام کی گاڑی سے موئن جودڑو روانہ ہو گیا۔

اُدھر عیار سپیرا بے ہوش ناگن کو پٹاری میں بند کیے موئن جودڑو پُہنچ چُکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موئن جودڑو کے قدیم کھنڈروں کے جنُوب میں ایک خاص کھنڈر ہے جس کے اندر ایک خُفیہ تہ خانہ ہے اور اِس تہ خانے کے آس پاس کہیں ہزاروں سال پُرانا ایک مندر ہُوا کرتا تھا، جہاں دیوی کا قیمتی خزانہ دفن ہے۔ سپیرا ناگن سانپ کی مدد سے وہ خزانہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چُناں چہ جنوبی کھنڈر میں پہنچتے ہی اُس نے

ناگن سانپ کی پٹاری کو تہ خانے میں ایک طرف رکھا اور منتر پڑھ کر سنگ ناگ سانپ کی رُوح کو بُلایا۔ اُس نے سانپ کی رُوح سے پُوچھا کہ دیوی کا خزانہ کہاں دفن ہے ؟

سنگ ناگ سانپ کی دُھندلی رُوح نے کمزور آواز میں کہا :

"سپیرے ! جس خزانے کی تُم تلاش میں ہو، وہ دیوی کے ایک بے حد قیمتی ہار کی شکل میں اس تہ خانے کے نیچے کافی گہرائی میں دفن ہے۔"

سپیرے نے کہا "اے سنگ ناگ سانپ کی رُوح ! مجھے دیوی کا خزانہ چاہیے۔ میں خزانے کی تلاش میں ہُوں۔ ہار لے کر کیا کروں گا۔"

"نادان سپیرے ! دیوی کا یہ ہار ہزاروں خزانوں سے زیادہ مہنگا اگر یہ ہار تمھارے ہاتھ آگیا تو تمھاری سات پُشتیں عیش کریں گی۔"

سپیرا بولا "سنگ ناگ کی رُوح ! میں یہ ہار زمین کے اندر سے کیسے نکال سکوں گا ؟ میں نے ناگن کو قابُو میں کر لیا ہے۔ میں تمھارا چیلا ہُوں۔ میری مدد کرو۔"

سنگ ناگ کی رُوح نے کہا "صرف ناگن ہی زمین کے نیچے سے یہ اَن مول ہار نکالنے میں تمھاری مدد کر سکتی ہے۔ مگر ناگن راگنی خود ایک زبردست ناگن ہے۔ اگر تمھارا منتر اُلٹا پڑا تو پھر خود تمھاری جان خطرے میں ہوگی۔ ناگن کی ایک پھونک تمھیں جلا کر راکھ کر دے گی۔"

سپیرے نے کہا "میرا منتر کبھی اُلٹا نہیں پڑے گا۔"

سنگ ناگ کی رُوح بولی "میں اب بھی تمھیں یہی مشورہ دُوں گا کہ اِتنا لالچ اچھا نہیں ہوتا۔ ناگن راگنی کو چھوڑ دو۔"

سپیرے نے چلاّ کر کہا "ہرگز نہیں۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہُوں؟ ناگن راگنی زندگی میں ایک بار ہی ملتی ہے۔"

"تو پھر جو چاہے کرو۔ میں جا رہا ہُوں۔" یہ کہہ کر سنگ ناگ کی رُوح غائب ہوگئی۔

سپیرے نے ناگن سانپ کو پٹاری میں سے نکالا۔ وہ بے ہوش تھی۔ ناگن کو اپنے قابُو میں کرنے اور اس کو اپنے حکم پر چلانے کے لیے سپیرے کو تین راتوں کا چِلّہ کاٹنا تھا۔ اُس نے کھنڈر کے باہر جا کر چاروں طرف ایک لکیر کھینچ دی اور اُس پر منتر پڑھ کر پھونک دیا۔ یہ اگنی منتر تھا۔ اب سوائے سپیرے کے کوئی دُوسرا اس لکیر کو پار کرتا تو آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا۔ اس کام سے فارغ ہو کر سپیرے نے ناگن سانپ

کے گرد بھی ایک دائرہ کھینچ دیا۔ اِس وقت رات ہونے والی تھی۔ سپیرا وقت ضائع کرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ ناگن کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

اُس نے پانی سے بھرا ہُوا ایک کمنڈل پہلے ہی سے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ یہ منتر اِتنا گرم اور آتشیں تھا کہ ہر دس منٹ کے بعد سپیرے کو منتر پڑھتے پڑھتے اپنی زبان پانی میں ڈال کر ٹھنڈی کرنی پڑتی تھی۔ ساری رات وہ آتشی منتر پڑھتا رہا۔ ناگن سانپ اس کے سامنے زمین پر بے ہوش پڑی رہی۔ اسے تیسری رات چِلّہ ختم ہونے کے بعد ہوش آنا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد وہ سپیرے کی غُلام بن جاتی۔

جب موئن جودڑو کے کھنڈروں میں دِن کی روشنی پھیلنے لگی تو سپیرے نے منتر پڑھنا بند کر دیا۔ وہ اُٹھا اور کھنڈر کے تہ خانے سے نِکل کر ایک تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ اس کا جسم منتر پڑھنے سے اِتنا گرم ہو گیا تھا کہ جہاں اُس نے چھلانگ لگائی تھی، وہاں سے بھاپ اُٹھنے لگی۔ جب اُس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا اور بدن کی تپش جاتی رہی تو وہ واپس کھنڈر کے تہ خانے میں آ کر سو گیا۔ اُسے اطمینان تھا کہ کھنڈر کے گرد طلسمی دائرہ کھنچا ہُوا ہے۔ اگر کسی نے اندر آنے کی کوشش کی تو وہ جل کر راکھ ہو جائے گا۔

اُسی رات کامران بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُس کے پاس ناگن راگنی کے دیے ہُوئے سُرخ مُہرے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اُس نے پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ جیب میں کچھ رُوپے اور ایک شکاریوں والا چاقو تھا۔ موئن جودڑو کے کھنڈر ویران پڑے تھے۔ اُس روز وہاں بھی

آسمان پر بادل چھائے ہُوئے تھے۔ مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ کامران ناگن راگنی کو سپیرے کی قید سے چھڑانے کے لیے بے چین تھا۔ اُسے اپنے کراماتی پُراسرار نقاب سے زیادہ ناگن راگنی کی زندگی کی فکر تھی۔ اُس نے سوچا کہ سب سے پہلے یہاں کے کسی سانپ سے مشورہ کرنا چاہیے۔ جنُوبی کھنڈر اُس سے کُچھ ہی فاصلے پر تھا۔ مگر وُہ کسی سانپ سے مشورہ کیے بغیر اُدھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ دادا سانپ نے اُسے خبردار کر دیا تھا کہ خطرناک سپیرے سے بچ کر رہے۔

وُہ اینٹوں کی ایک ہزاروں سال پُرانی دیوار کے پیچھے آ گیا۔ اُس نے خاص منتر پڑھا اور آواز دی "یہاں کوئی سانپ ہے تو سامنے آئے!"

ایک نیلے رنگ کا سانپ کھنڈر کی اینٹوں میں نکل کر کامران کے سامنے آگیا اور آداب بجالا کر بولا "عظیم ناگ دیوتا کے بھائی نے مُجھے کس لیے یاد کیا؟"

کامران نے جب اُسے بتایا کہ وُہ کس غرض سے وہاں آیا ہے اور اُسے کیا مُشکل درپیش ہے تو نیلے سانپ نے کہا "عظیم ناگ کے بھائی! ناگن راگنی سانپ کی شکل میں اِس وقت جنُوبی کھنڈر کے تہ خانے میں بے ہوش پڑی ہے اور سپیرے نے اُس پر منتر پڑھتے ہُوئے ایک رات کا چِلّہ پُورا کر لیا ہے۔ اب صرف دو راتوں یعنی آج اور کل کی رات کا چِلّہ باقی رہ گیا ہے۔"

کامران نے کہا "کیا تُم ناگن راگنی کو وہاں سے نکالنے میں میری مدد کرسکتے ہو؟"

نیلا سانپ کہنے لگا "ناگ دیوتا کے بھائی! سپیرے کے پاس آتشی منتر ہے۔ اُس نے کھنڈر کے گرد اِس منتر کا دائرہ کھینچ رکھا ہے۔ جو کوئی اس دائرے کو پار کرنے کی کوشش کرے گا، جل کر راکھ ہو جائے گا۔"

کامران نے پُوچھا "وُہ بدمعاش سپیرا کہاں ہے؟"

نیلے سانپ نے بتایا کہ سپیرا کھنڈر کے تہ خانے میں ناگن سانپ کے پاس گہری نیند سو رہا ہے اور ناگن سانپ بے ہوش ہے۔"

کامران نے جُھنجھلا کر کہا "میں اُس سپیرے کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

نیلا سانپ کامران کے سامنے آگیا اور ادب سے بولا "عظیم ناگ کے بھائی! آپ انسان ہیں۔ مجھے یہ معلوم ہے۔ آپ ایسی غلطی نہ کریں۔ ہاں، اگر ناگ دیوتا ہوتا تو وہ ایک پل میں سپیرے کو موت کی نیند سُلا دیتا۔ لیکن آپ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ بھی مر جائیں اور ناگن بھی دیوی کی بددُعا سے ہمیشہ کے لیے پتھر بن جائے۔ کیوں کہ سپیرا تو دیوی کا مُقدس ہار لے کر یہاں سے فرار ہو جائے گا۔ دیوی کی بددُعا کا اثر صرف ہار لانے والے سانپ یعنی ناگن راگنی پر پڑے گا۔"

کامران سوچ میں پڑ گیا۔ نیلے سانپ نے اسے دُرست مشورہ دیا تھا۔ اِس نے پُوچھا تو پھر مُجھے کیا کرنا چاہیے؟ تُم ہی کوئی ایسی راہ بتاؤ کہ ناگن سانپ سپیرے کے چُنگل سے نِکل آئے۔"

نیلا سانپ پہلے تو پھن نیچے کیے خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا "میں آپ کو یہی مشورہ دُوں گا کہ کسی طریقے سے ناگ دیوتا کو تلاش کر کے یہاں لائیں۔ صرف ناگ دیوتا ہی ناگن راگنی کو سپیرے کے پنجے سے چھڑا سکتا ہے۔"

کامران سمجھ گیا کہ نیلے سانپ سے مزید بات چیت کرنا بے کار ہے۔ اُس نے خود آگے بڑھ کر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب رات آدھی گزر گئی تو وہ جنُوبی کھنڈر کی طرف بڑھا۔ وہ جانتا تھا کہ سپیرا اس وقت تہ خانے میں منتر پڑھنے میں لگا ہو گا۔ وُہ باہر نہیں آئے گا۔ کامران کو اس لکیر کا بھی عِلم تھا جو سپیرے نے منتر پڑھنے کے بعد کھنڈر کے چاروں طرف کھینچ دی تھی۔ اِس کے باوجود وہ جنُوبی کھنڈر کی طرف بڑھتا گیا۔ رات اندھیری تھی۔ بادلوں کی وجہ سے تارے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہزاروں سال پُرانے کھنڈر خاموش تھے، جیسے اُن پر آسیب چھایا ہُوا ہو۔

جنُوبی کھنڈر کے پاس آکر کامران رُک گیا۔ اب وہ پھُونک پھُونک کر قدم اُٹھا رہا تھا۔ کیوں کہ وُہیں کہیں سپیرے کی طِلسمی لکیر شرُوع ہو جاتی تھی۔ کھنڈر کا ٹوٹا پھُوٹا دروازہ تین قدم کے فاصلے پر تھا۔ کھنڈر کے تہ خانے کے سپیرے کے منتر پڑھنے کی آواز اسے سُنائی دینے لگی۔

جُوں ہی اُس نے دُوسرا قدم اُٹھایا، اسے ایک دھچکا لگا اور وہ دھڑام سے پیچھے گر پڑا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر وُہ اُٹھ نہ سکا۔ اُس کا پاؤں سپیرے کی کھینچی ہُوئی لکیر پر پڑ گیا تھا۔ اگر اس کی

جگہ کوئی سانپ یا عام آدمی ہوتا تو جل کر راکھ ہوگیا ہوتا۔ لیکن کامران ناگ دیوتا کا دوست تھا اور اس کے جسم سے ناگ دیوتا کی خُوش بُو آرہی تھی۔ اِس لیے اسے صرف دھچکا لگا اور وُہ بے ہوش ہوگیا۔

سپیرے کو اُسی وقت پتا چل گیا کہ کسی نے لکیر پار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وُہ جلدی سے باہر نِکل آیا۔ رات کے نیم اندھیرے میں اُس نے جُھک کر بے ہوش کامران کو دیکھا۔ وُہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی خاص آدمی ہے جس کو اس کی کھینچی ہُوئی لکیر نے جلایا نہیں بلکہ صرف بے ہوش کر دیا ہے۔ یہ لڑکا اُس کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ چُناں چہ اُس نے کامران کو اُٹھایا اور کھنڈر کے نیچے لے جاکر ایک دُوسرے تہ خانے میں بند کر دیا اور پھر واپس آکر بے ہوش ناگن راگنی کے آگے منتر کا جاپ شرُوع کر دیا۔

دُوسرے دِن سپیرے نے تہ خانے میں جاکر کامران کو دیکھا۔ وُہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ سپیرے کو معلوم تھا کہ ابھی دو دِن تک اسے ہوش نہیں آئے گا اور آج اس کے چلّے کی آخری رات تھی۔ سارا دِن سپیرا کھنڈر کے باہر چُھپ کر بیٹھا ناگن کی چوکیداری کرتا رہا۔ پھر رات آگئی۔ یہ چلّے کی آخری رات تھی۔ اِس رات کے پچھلے پہر اس نے ناگن سانپ کو اپنے قبضے میں کر لینا تھا۔ وہ رات ہوتے ہی چلّہ کرنے بیٹھ گیا۔ ساری رات وہ آتشی منتر پڑھتا رہا اور پانی میں زبان ڈال ڈال کر ٹھنڈی کرتا رہا۔ جب رات کا پچھلا پہر ہُوا تو اُس کا چلّہ ختم ہوگیا۔

تب سپیرے نے بے ہوش ناگن کو پھُونک ماری اور کہا "ناگن! میرے حُکم سے لڑکی کی شکل میں آجا۔"

ناگن کے جسم میں حرکت پیدا ہُوئی اور وُہ ایک سیکنڈ میں پھُنکار مار کر وُہی سُنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی بن گئی۔ سپیرا بے حد خوش ہُوا۔ اس کا چلّہ کامیاب ہوگیا تھا۔ اُس نے ناگن راگنی کی طرف دیکھ کر کہا "میں کون ہُوں؟"

ناگن راگنی نے خواب ایسی آواز میں کہا "تُم میرے مالک ہو۔ تُم جو کہو گے، میں وہی کروں گی۔"

سپیرے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ رہا۔ وہ کہنے لگا "سُن! اِس تہ خانے کے نیچے ہزاروں سال پُرانا دیوی کا مندر تھا۔ اس مندر میں دیوی کا ہیروں کا ایک ہار دفن ہے۔ فوراً نیچے جاکر وہ ہار نِکال لا۔"

ناگن راگنی نے کہا "جو حکم، میرے مالک!"

اِتنا کہ کر ناگن راگنی نے اپنے حلق سے پھُنکار کی آواز نِکالی اور دُوسرے ہی لمحے وہ سانپ بن گئی۔ سانپ بنتے ہی اُس نے تہ خانے کے فرش کا ایک چکّر لگایا۔ پھر ایک جگہ اپنا مُنھ زمین کے ساتھ لگا دیا اور مٹّی کے اندر گھُس گئی۔ سپیرا بے تابی سے سانپ کو زمین کے اندر جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر کھنڈر کے باہر گیا۔ باہر پو پھٹ رہی تھی۔ موہن جو دڑو کے کھنڈر ویران پڑے تھے۔ آسمان پر اسی طرح ہلکے ہلکے بادل چھائے ہُوئے تھے۔ سپیرے کو جب اطمینان ہوگیا کہ کوئی نہیں ہے تو وُہ تہ خانے میں آگیا۔ اب اُس نے دِیا روشن کر دیا۔ چلّے کے دوران وہ دیا روشن نہیں کر سکتا تھا۔ ناگن زمین کے اندر گئی ہُوئی تھی۔ سپیرا بے چینی سے اس کے باہر آنے کا اِنتظار کر رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سپیرے کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اِسی طرح آدھا گھنٹا گزر گیا۔ پھر زمین کے اندر سے ناگن کا سر نمودار ہُوا۔

سپیرے کی آنکھیں کھُل گئیں۔ ناگن نے اپنے مُنھ میں دیوی کا قیمتی ہیروں والا ہار پکڑ رکھا تھا۔ ہیروں کی چمک سے سارا تہ خانہ روشن ہوگیا۔ ناگن ابھی باہر نہیں نِکلی تھی کہ سپیرے نے لپک کر اُس کے مُنھ سے دیوی کا ہار کھینچ لیا اور سینے سے لگا کر بولا:

"میں کروڑ پتی بن گیا ہُوں۔ میں کروڑ پتی بن گیا ہُوں۔ میں محل بناؤں گا۔ میری موٹر گاڑیاں ہوں گی۔"

ناگن باہر نکل کر کنڈلی مار کر بیٹھ گئی۔ سپیرے نے ہار کو اپنی صدری کی جیب میں چھپایا، بین اُٹھائی اور بولا "ناگن! جب تک میں نہ آؤں، تُو اسی جگہ بیٹھی رہنا۔"

ناگن ابھی لڑکی کی شکل میں نہیں آئی تھی۔ سانپ کی شکل میں ہی تھی۔ اُس نے کہا جو حکم میرے مالک!"

دراصل سپیرا ناگن کو وہیں چھوڑ کر فرار ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ناگن پر اب دیوی کی بد دُعا کا اثر ہونے والا ہے۔ وہ کھنڈر کے تہ خانے سے بھاگ گیا۔ اس کے جاتے ہی زمین کے سُوراخ میں سے نیلا دُھواں نکلنے لگا۔ پھر اس دُھوئیں نے دیوی کی شکل اختیار کر لی۔ دیوی کے ہاتھ میں ترشول تھا۔ اس نے ترشول کا رُخ ناگن سانپ کی طرف کرتے ہُوئے کہا :

"تُو نے میرا ہار چُرایا ہے۔ میں تجھے بد دُعا دیتی ہُوں۔ ساری زندگی کے لیے پتھر بن جا!"

اور ناگن سانپ کا جسم ایک دم سخت ہو گیا۔ اسے کچھ یاد نہ رہا کہ وُہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ کھنڈر کے دُوسرے تہ خانے میں کامران بے ہوش پڑا تھا۔ ناگن پتھر بن چکی تھی۔

اس کے بعد کے سنسنی خیز واقعات پڑھنے کے لیے "تعلیم و تربیت" کا آئندہ ماہ کا شمارہ خریدنا نہ بھُولیے گا۔

خُون کے گروپ

جِسم بیرونی اشیاء کے خلاف، جو خُون میں داخل ہو جاتی ہیں، بڑی سختی سے ردِ عمل ظاہر کرتا ہے۔ وُہ دُوسرے لوگوں کے خون کی ان بعض اقسام کو بھی برداشت نہیں کرتا جو بیماری یا حادثے کے باعث اُس میں منتقل کی جائیں۔ اگر کسی کے بدن میں زیادہ تعداد میں غلط قِسم کا خُون داخل کر دیا جائے تو وُہ مہلک ہو سکتا ہے۔

خُون کی چار بڑی قسمیں ہیں جنہیں خُون کے گروپ کہا جاتا ہے۔ یہ A,B,AB اور O کہلاتی ہیں۔ اگر آپ کے اپنے گروپ کے مُطابق خُون دیا جائے تو یہ بالکل محفُوظ ہوتا ہے۔ جب خُون دینا ضرُوری ہوتا ہے تو گروپ چیک کرنے کے لیے خُون کا ایک سادہ تجربہ کیا جاتا ہے۔ گروپ O کا خُون دُوسرے تمام گروپوں کو دیا جا سکتا ہے ماسوائے چند ایسے لوگوں کے جن کے خُون میں کچھ دُوسری اشیا ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔

مُختلف نسلوں میں خُون کے چاروں گروپوں کا تناسب مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر امریکی انڈین مکمل طور پر گروپ O ہوتے ہیں، جبکہ برِصغیر کے لوگوں میں عام طور پر کم یاب گروپ B کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔

اُف یہ گرمی

رمضان گوہر

چڑھا دن تو سورج چمکنے لگا — ہر اک ذرّہ ذرّہ دمکنے لگا
نکلتے ہی سورج جو گرمی پڑی — تو پھولوں پہ ڈھائی قیامت بڑی
بجے دن کے بارہ تو دھرتی تپی — لگا جیسے ہر چیز جلنے لگی
جونہی لُو کے آنے کا ڈنکا بجا — ہر اک بچّہ بوڑھا بلکنے لگا
ہر اک سُو برستی ہوئی آگ ہے — ہر اک سُو لپکتی ہوئی آگ ہے
پرندے ہیں شاخوں پہ بیٹھے ہوئے — پریشاں ہیں اور چونچیں کھولے ہوئے
ہیں ویران سڑکیں، ہے بے رونقی — نہ سبزے میں ہے اب کہیں تازگی
یہ ڈھور اور ڈنگر ہیں گھبرائے سب — جہاں پانی دیکھا، وہیں آئے سب
بڑے چھوٹے نہروں پہ جانے لگے — مگن ہو کے غوطے لگانے لگے
تپی ہیں دکانیں، تپے ہیں مکاں — ہیں گلیوں محلّوں میں ویرانیاں

دُنیا کا قدیم اِنسان

محمد اقبال ثاقب

آج سے لاکھوں سال پہلے جب چھوٹے چھوٹے سبزی خور جانوروں میں تبدیلیاں رونما ہوئیں تو ان میں سے کچھ جانور بندر اور کچھ انسان بن گئے۔بندر اور انسان کافی مِلتے جُلتے تھے ۔ جانوروں کی اس نئی مخلوق کے دِماغ دوسرے جانوروں سے بڑے تھے ۔ اس لیے وہ زیادہ چالاک اور سمجھدار تھے ۔ اُن کے ہاتھ تھے جن سے وہ چیزوں کو پکڑ سکتے تھے ۔ بندر اور اِنسان صرف قوّتِ گویائی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے ۔ اِنسان آپس میں باتیں کرسکتے تھے جب کہ بندر اس خوبی سے محروم تھے ۔

آج سے لگ بھگ ایک لاکھ سال پہلے کی انسانی مخلوق تقریباً ہمارے ہی جیسی تھی ۔ یہ مخلوق درختوں میں رہنے کی بجائے باہر کُھلی فضا میں آئی اور سیدھے کھڑے ہو کر چلنا پھرنا شروع کر دیا ۔ اب اُس کے ہاتھ مکمل طور پر چیزیں پکڑنے کے قابل تھے ۔

پتّھر کے قدیم زمانے کا انسان : شروع کا وہ دور جب انسان پیدا ہوا اسے قدیم پتّھر کا زمانہ کہتے ہیں ۔ اس دور میں انسان نے پتّھر کو اوزار کے طور پر استعمال کرنا سیکھا ۔ خوراک کے لیے انسان درختوں کے پَھل اور جڑیں کھانے کے علاوہ کیڑے مکوڑے ، شہد اور پرندوں کے انڈے بھی کھاتا ۔ وہ بڑے بڑے دیو قامت بھینسے اور ہاتھی جیسے جانوروں کا شکار کرتا ۔ شکار کرنے کے لیے انسان ان جانوروں کو گھیر کر دلدل میں لے جاتا اور جب جانور دلدل میں پھنس جاتے تو ان کو پتّھر کے اوزار سے ہلاک کرکے اس کا گوشت کھا جاتا ۔ بعض اوقات وہ جانوروں کے اردگرد کی جھاڑیوں اور گھاس پُھوس کو ایک دائرے کی شکل میں آگ لگا دیتا اور انہیں بے بس کر کے پتّھروں اور لاٹھیوں سے شکار کرلیتا

اوزار : ابتدائی اِنسان نے اپنے اِردگرد جو بھی چیز دیکھی اسی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر لیا ۔ اس نے لکڑی اور پتّھر کو جانوروں کا شکار کرنے کے لیے استعمال کیا اور بڑے بڑے جانوروں کی ہڈیوں کو بھی بطور ہتھیار استعمال میں لایا ۔ سب سے پہلے اِنسان نے پتّھر کو ہتھوڑے کے طور پر استعمال کیا اور

جانوروں کی ہڈیاں توڑ کر ان سے گودا نکالا ۔ پھر اُس نے نوکدار لکڑی کو درختوں کی جڑیں نکالنے کے لیے استعمال کیا، قدیم اِنسان نے پتھر کے تیز دھار اوزار بھی بنانا سیکھ لیے اُس نے پتھر کے ایسے کلہاڑے بنائے جو ایک طرف سے تیز ہوتے تھے ۔ ان کو وہ لکڑیاں اور گوشت کاٹنے کے لیے استعمال کرتا تھا ۔ اُس نے پتھر کے چاقو بھی بنائے جن سے وہ جانوروں کی

کھالیں صاف کرتا تھا ۔ قدیم انسانوں نے بڑے بڑے جانوروں کو شکار کرنے کے لیے پتھر کے نوکدار نیزے بھی ایجاد کیے ۔ مچھلیوں کا شکار کرنے کے لیے خمدار سینگوں کے کانٹے بنائے اور مچھلیوں کا شکار کرنے لگا ۔

آگ : قدیم اِنسان نے آگ ایک حادثے کے نتیجے میں حاصل کی ۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کسی آتش فشاں پہاڑ کا لاوا آگ کا باعث بنا ۔ جب یہ لاوہ پھوٹا تو آس پاس کی خُشک گھاس اور لکڑیوں کو آگ لگ گئی ۔ پہلے تو اِنسان اِس آگ سے ڈرا ۔ لیکن بعد میں جب وہ اس سے مانوس ہوگیا تو جلتی ہوئی لکڑیاں غاروں میں لے آیا اور ان کو لمبے عرصے تک متواتر جلائے رکھا ۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ اسطرح آگ کو روشن رکھنے سے بہت سارا ایندھن ضائع ہو جاتا تو اس نے آگ جلانے کا مصنوعی طریقہ دریافت کر لیا ۔ اس نے یہ آگ پتھر کو پتھر سے رگڑ کر جلائی ۔ اس آگ سے قدیم انسان سرد راتوں کو حرارت حاصل کرتا ۔ شُروع شُروع میں وہ کچا گوشت کھاتا تھا ۔ لیکن جب اس نے آگ جلانا سیکھ لیا تو گوشت کو بُھون کر کھانے لگا ۔ یہ بُھنا ہوا گوشت آسانی سے کھایا جاسکتا تھا اور کچے گوشت سے زیادہ مزے دار تھا ۔

رہائش : قدیم پتھر کے زمانے کا اِنسان کسی ایک جگہ نہیں رہتا تھا ۔ جانوروں کے شکار کے لیے گھومتا پِھرتا رہتا ۔ وہ صرف معمولی سامان اپنے پاس رکھتا ، دریاؤں اور جھیلوں کے ساتھ ساتھ عارضی رہائش اختیار کرتا اور ان جانوروں کو شکار کرتا جو وہاں پانی پینے آتے ۔ سرد علاقوں میں وہ زمین کے اندر گڑھے کھود لیتا اور انہیں لکڑیوں اور گھاس وغیرہ سے ڈھانپ دیتا۔ بعض لوگوں نے جانوروں کی کھالوں کے خیمے بھی بنا لیے اور بعض نے رہنے کے لیے غاروں میں بھی پناہ لی ۔ بعض لوگوں نے ان غاروں کی دیواروں اور چھتوں پر تصویریں بنائیں ۔ وہ اس تصویر کشی کو جادُو کا کام سمجھ کر کرتے تھے ۔ ان کا یقین تھا کہ یہ تصویریں شکار کھیلنے میں ان کی مدد کرتی ہیں ۔ غاروں میں وہ آتش دان روشن کرتے اور ان میں آگ جلا کر اردگرد سو جاتے ۔

لباس : پتھر کے دور کے قدیم انسان صرف گرم جگہوں پر رہتے تھے ۔ ان کے جسموں پر لمبے لمبے بال تھے جس کی وجہ سے ان کو لباس کی ضرورت نہیں تھی ۔ پھر آہستہ آہستہ جب انہوں نے شکار کے لیے سرد علاقوں میں بھی جانا شروع کیا تو ان کو سردی محسوس ہوئی اور انہوں نے جانوروں کی کھالوں کو بطور لباس استعمال کرنا شروع کر دیا ۔ انہوں نے نوکدار ہڈیوں

سے سوئیاں بنائیں اور کھالوں کو آپس میں جوڑ کر لباس بنایا اور اس کو پہننا شروع کر دیا ۔

پتّھر کے جدید زمانے کا انسان : پتھر کے قدیم زمانے کا انسان اپنی خوراک کے لیے جانوروں کو شکار کرتا تھا جبکہ پتّھر کے جدید زمانے کے اِنسان نے کھیتی باڑی بھی سیکھ لی ۔ اب اس نے کم خطرناک جانوروں کو پالنا شروع کر دیا اور ان سے کام لینے کے لیے انہیں سدھا لیا ۔ جن جانوروں کو انسان نے پہلے پہل سدھایا ان میں بھیڑ ، بکری اور گائے
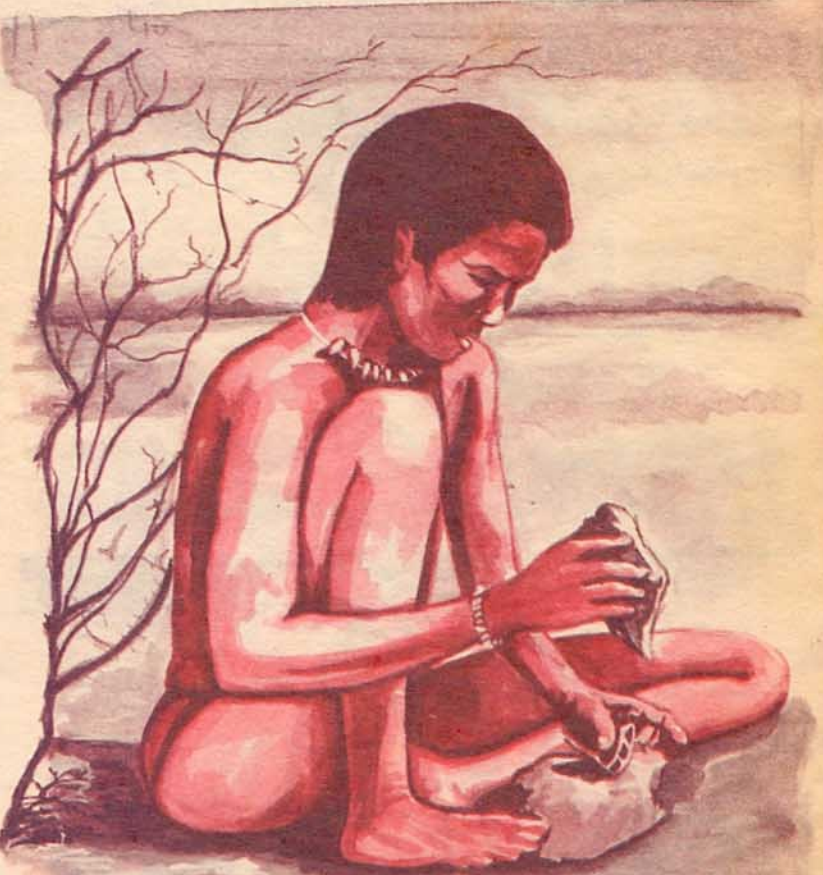
شامل ہیں ۔ وہ ان جانوروں سے دودھ حاصل کرتا اور ان کا گوشت بھی کھاتا ۔ اس نے جانوروں کی کھال اور اُون سے لباس بنانا بھی سیکھ لیا ۔

پتّھر کے جدید زمانے کے انسان نے اپنی رہائش کے لئے قریبی جنگلوں کو آگ لگادی اور پھر نوکدار اوزاروں کی مدد سے زمین کو نرم کیا اور ان میں فصلیں اُگانے لگا ۔ سب سے پہلے اُس نے گندم اور مکئی کے بیج بوئے اور خوراک کے لیے غلّہ حاصل کیا ۔ اس غلّے کو اس نے پتّھروں سے کوٹ کر دلیے کی طرح کا آٹا بنایا اور اُس سے روٹیاں پکائیں ۔

گھر اور بستیاں : اب چونکہ انسان نے جانور پالنا اور فصلیں اُگانا سیکھ لیا تھا اس لیے اسے اب خوراک کے لیے اِدھر اُدھر گھومنے کی ضرورت نہیں تھی ۔ اب اس نے زرخیز زمین اور پانی کے قریب مستقل گھر بنانے شروع کر دیئے یہ گھر مٹی اور گارے کے تھے کچھ لوگوں نے پتھر اور لکڑی کے گھر بھی بنالیے ۔

لباس ، برتن اور زیورات : مستقل گھر بنانے کے بعد اب انسان کے پاس نئی نئی چیزیں بنانے کے لیے کافی وقت تھا ۔ اب اُس نے اُون سے کپڑا بنانا بھی سیکھ لیا اور برتن بنانے کے لیے مٹّی کو استعمال کیا ۔ مٹّی کے برتنوں کو دھوپ میں خُشک کیا جاتا تھا اور بعد میں ان کو آگ میں پکایا جاتا تھا ۔ آج کل بھی کمہار اسی طرح برتن بناتے ہیں ۔

پتّھر کے قدیم زمانے کا اِنسان جانوروں کے دانتوں سے زیورات بناتا تھا ۔

جدید اِنسان نے ہڈیوں اور دانتوں کے علاوہ رنگدار پتّھروں سے بھی زیورات بنانا شروع کر دیے ۔

کشتیاں : پتّھر کے جدید زمانے کے اِنسان نے خُشکی کے بعد پانی کی سطح پر بھی قدم جمانے شروع کر دیے ۔ سب سے پہلے اس نے کھوکھلی لکڑی سے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنائیں اور بعد میں لکڑیوں کے فریم پر کھالیں لگا کر بڑی بڑی کشتیاں بھی بنالیں ۔

اِس دور کے اِنسان نے اپنے رہنے سہنے میں کافی حد تک اصلاح کر لی ۔ اب اسکی زندگی قدیم اِنسان کے مقابلے میں کافی آسان تھی ۔ اِس نے اپنی سہولت کے لیے نئی نئی چیزیں بھی ایجاد کر لی تھیں ۔

چاند ہوٹل

محمد یونس حسرت

میں اپنے آپ کو، اپنی پنکچر ہو جانے والی سائیکل کو اور بارش کو بُری طرح کوس رہا تھا کہ سامنے کہیں دُور ایک مدھم سی روشنی نظر آئی۔ اِس مدھم سی روشنی نے میرے دِل میں اُمّید کے بُجھتے ہوئے دِیے کو پھر روشن کر دیا۔ اور میں خُود گھسٹتا اور سائیکل کو گھسیٹتا ہُوا اُس سڑک پر آگے بڑھنے لگا جو بارش کی وجہ سے دَل دَل کی صُورت اِختیار کر چُکی تھی۔

میں نے اپنی رفتار بڑھانے کی کوشش کی۔ روشنی واضح ہوتی گئی اور جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ روشنی ایک لالٹین سے آ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد قریب پہنچا تو معلوم ہُوا کہ یہ لالٹین ایک ہوٹل کی چھت سے لٹک رہی ہے۔ بیرُونی دروازے کے اُوپر ٹین کا ایک پُرانا سائن بورڈ ہوا میں جھول رہا تھا۔ اُس پر چاند ہوٹل کے الفاظ اب بھی کُچھ کُچھ پڑھے جا سکتے تھے۔ میں نے خُدا کا شُکر کیا کہ رات گُزارنے کا کوئی ٹھکانا نظر تو آیا۔ اِطمینان کا ایک سانس لے کر میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

میرے سامنے ایک لمبی سی راہ داری تھی جس کے سرے پر ایک اور لالٹین برائے نام روشنی اِردگرد کی فضا میں بکھیر رہی تھی۔ میرے بائیں طرف ایک دروازہ کھُلا تھا۔ میں نے سائیکل راہداری میں کھڑی کی اور اندر داخل ہو گیا۔

اندر ایک آدمی اخبار پر جُھکا ہُوا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر اُس نے نظریں اُٹھائیں تو میں نے اُسے ہاتھ اور سر کے اشارے سے سلام کیا اور کہا "کیا آپ مجھے ایک رات یہاں ٹھہرنے کے لیے جگہ دے سکتے ہیں؟"

اُس نے میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور پھر کہنے لگا "اِس خراب موسم میں اور پھر رات کے وقت تو کوئی کُتّا بھی باہر نہیں پھرتا۔ آپ اِدھر کیا کرتے پھر رہے ہیں؟"

"مجھے روشن پُور جانا تھا۔ جب میں روانہ ہُوا تو موسم ٹھیک ٹھاک تھا۔ مگر پھر بارش اور ہوا کی مُصیبت شرُوع ہو گئی اور پھر یہاں سے کوئی دو میل پرے میری سائیکل بھی پنکچر ہو گئی۔ بڑی مُشکل سے یہاں تک پُہنچا ہُوں ـــــ کیا مجھے یہاں ٹھہرنے کے جگہ مل جائے گی؟"

"مُشکل ہے" اس اَدھیڑ عُمر کے آدمی نے جواب دیا "ہمارے ہوٹل میں سردیوں میں تو مُسافروں کے ٹھہرنے کا اِنتظام سرے سے ہے ہی نہیں۔ اور گرمیوں میں بھی یہاں گنتی کے چند مُسافر رات کو ٹھہرتے ہیں۔"

"مگر میں اس منحُوس رات میں کہاں جا سکتا ہُوں، جناب؟" میں نے کہا "مجھے رات گُزار لینے دیجیے۔ کہیں بھی پڑ کر سو رہُوں گا۔"

اس آدمی نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد کہا "اِس کا فیصلہ تو چاند خان ہی کر سکتے ہیں جو اِس ہوٹل کے مالک ہیں۔"

وہ اُٹھ کر ایک ایسے دروازے کے اندر چلا گیا جس پر ایک

پردہ پڑا ہُوا تھا تھوڑی دیر بعد وُہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک لمبا اور بھاری بھرکم آدمی تھا جو چالیس پینتالیس سال کا دکھائی دیتا تھا ـــــ اس کا چہرہ گوشت سے پُر تھا۔ ناک پر کسی زخم کا نشان تھا اور اس نے کئی دنوں سے شیو نہیں کی تھی ـــــ یقیناً یہی اس ہوٹل کا مالک چاند خان تھا۔ میں نے جُھک کر آداب کیا جس کا جواب اُس نے سر کے ہلکے سے اشارے سے دیا اور پھر کہنے لگا :

"رمضانی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کو رات گزارنے کے لیے کمرا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ اِن دنوں ہمارے پاس کسی مُسافر کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ گرمیوں میں بھی ہم دو چار آدمیوں ہی کے لیے اِنتظام کر پاتے ہیں۔"

یہ کہتے ہُوئے اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر شک بھرے انداز میں بولا "آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟"

"میرا نام ارسلان ہے" میں نے کہا "اور میں لاہور کا رہنے والا ہُوں۔"

"لیکن لاہور سے سینکڑوں میل دُور آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟" چاند خان نے شک بھرے انداز میں کہا "اور وہ بھی سائیکل پر؟"

میں نے جھجکتے ہُوئے کہا "بات یہ ہے جناب، کہ میں روشن پور میں اپنے انکل سے مِلنے آیا ہُوں۔ مجھے سائیکل چلانے کا بہت شوق ہے۔ اِس لیے سائیکل لے کر سیر کو نکل گیا تھا۔ یہاں سے ساتویں آٹھویں میل پر جو چوراہا ہے، وہاں سے واپس ہُوا تھا اور میرا خیال تھا کہ شام سے پہلے پہلے روشن پُور پہنچ جاؤں گا۔ مگر بارش، ہوا اور پھر سائیکل پنکچر ہو جانے کی وجہ سے میرا سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد چاند خان نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہم آپ کے لیے یہاں رات گزارنے کا بندوبست کر دیں گے۔ مگر صرف آج رات کے لیے۔"

"شُکریہ" میں نے جواب میں کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

اُس نے سر کے اشارے سے میرا شکریہ قبول کیا اور چلا گیا۔

رمضانی میری سائیکل ہوٹل کے پچھلے حِصّے میں رکھنے چلا گیا۔ میں نے اُسے سائیکل کی ٹوکری اُتار لانے کو کہہ دیا تھا۔ اُسے گئے تھوڑی دیر ہی ہُوئی تھی کہ سامنے کا دروازہ آہستگی سے کُھلا اور سانولے رنگ کا ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا اندر آیا۔ وُہ ایک دُبلا پتلا سا لڑکا اور اس کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔ جیسے اُس کے دِل میں کسی بات کا ڈر بیٹھا ہُوا تھا۔

"آئیے، مسٹر ارسلان" لڑکے نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں اُس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم راہداری سے گزرے اور پھر دائیں طرف ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرا چاند ہوٹل کا ڈائننگ ہال تھا۔ لڑکے نے ایک الماری سے جھاڑن نکال کر میز صاف کی اور پھر بولا "ہم آپ کی زیادہ خاطر تواضع نہیں کر سکیں گے، جناب۔ پھر بھی دیکھتے ہیں آپ کے لیے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا اور میں کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے اِردگرد نظریں دوڑائیں تو ایک کونے میں ایک چھوٹا سا میز دکھائی دیا جس پر ایک رجسٹر پڑا تھا۔ قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہُوا کہ یہ ہوٹل میں آنے والے مُسافروں کا رجسٹر ہے۔ میں نے اپنی جیب سے قلم نکالا اور خالی لائن پر اپنا نام لکھنے ہی لگا تھا کہ ایک دم رُک گیا۔ مجھے محسوس ہُوا کہ اس لائن پر کسی نے پہلے ہی اپنا نام لکھا تھا۔ مگر اس لکھے ہُوئے نام کو مٹا دیا گیا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ مجھ سے پہلے چاند ہوٹل میں کون آکر ٹھہرا تھا اور پھر رجسٹر میں سے اس کے نام کو مٹا کیوں دیا؟ لڑکے کی آنکھوں سے خوف کیوں جھلک رہا تھا؟ ہوٹل کا مالک مجھے ہوٹل میں رات بسر کرنے کی اجازت دینے کے بارے میں ہچکچا کیوں رہا تھا؟ یُوں لگتا تھا جیسے ان سب باتوں کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ہے ـــــ میں سوچوں میں کھویا ہُوا تھا کہ قدموں کی آہٹ سُن کر دوبارہ اپنی جگہ

پر آبیٹھا۔

لڑکے نے اندر آکر میز پر کھانا لا رکھا، اور چلا گیا۔ میں نے کھانے سے فراغت پائی تو رمضانی آگیا۔ وہ مجھے دوسری منزل پر اس کمرے میں لے گیا جہاں میرے لیے رات بسر کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ ایک غلیظ سا کمرا تھا جس میں نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ پڑا تھا اور بستر بھی کچھ ایسا صاف نہ تھا۔ لیکن اُس وقت مجھے وہ گندہ بستر بھی پھولوں کی سیج لگا اور اُس پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح کو چاند ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو میز پر ایک اخبار پڑا نظر آیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ کوئی دو چار دِن پہلے کا اخبار ہوگا۔ مگر اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہُوا کہ اِسی دِن کا تازہ اخبار ہے۔ وہ سانولے سے رنگ کا لڑکا برتن اُٹھانے آیا تو میں نے حیران ہو کر اُس سے پُوچھا "کیا یہاں اخبار اِتنی جلدی آجاتا ہے؟"

لڑکے نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد کہا "نہیں، جناب۔ یہ تو آفتاب خان اپنے ساتھ لائے ہوں گے۔ وہ صُبح ہی صُبح آ گئے تھے۔ اکثر آتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہوٹل کے مالک کے بڑے گہرے دوست ہیں نا۔"

"کیا وہ یہاں ٹھہریں گے؟"

"پتا نہیں۔ کبھی وہ یہاں ٹھہرتے ہیں اور کبھی نہیں ٹھہرتے۔ ویسے اکثر سفر میں رہتے ہیں۔" پھر اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہُوئے کہا "موسم تو اب بھی ٹھیک نہیں ہُوا۔ خُدا کرے آپ خیریت سے سفر کر سکیں۔"

"یہ تو سائیکل کی ٹیوب اور ٹائر دیکھ کر پتا چلے گا،" میں نے کہا۔ پھر ایک نظر اخبار پر ڈالتے ہُوئے بولا "اخبار میں کوئی خاص خبر نہیں، سوائے اِس کے کہ سمندر سے ایک اور آدمی کی لاش ملی ہے۔"

"ایک اور؟" لڑکے نے حیرانی سے پُوچھا۔

"ہاں،" میں نے جواب دیا "کیا چند ہفتے پہلے یہاں کے ساحل کے قریب ایک آدمی نہیں ڈُوب گیا تھا؟ میں نے اخبار میں خبر بھی پڑھی تھی۔ سُلیمان تھا شاید اُس کا نام۔ یہاں سے میل ڈیڑھ میل پرے ایک کھاڑی میں اُس کی لاش ملی تھی۔ اُس وقت اسے ڈوبے ہُوئے دو تین دِن ہو گئے تھے۔"

"ہاں،" لڑکے نے جواب دیا "میں نے بھی اِس بارے میں کچھ سُنا تھا۔ سُنا ہے کہ وُہ بے چارہ تفریح کے لیے یہاں آیا تھا اور تیرتے ہُوئے پانی کی لہریں اُسے بہالے گئی تھیں۔"

"کیا واقعی ایسا ہی ہُوا تھا؟" میں نے حیرانی سے کہا "پھر تو اُسے تیراکی کے لباس میں ہونا چاہیے تھا، جبکہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ وہ عام لباس پہنے ہُوئے تھا۔"

"مُعاف کیجیے، جناب" لڑکے نے ایک دم کہا "مجھے کچن میں کام ہے۔" وہ برتن اُٹھا کر چلا گیا اور کئی سوال میرے ذہن میں کُلبلاتے رہ گئے۔

ناشتے کے بعد میں نے چاند ہوٹل کے پچھلے حصّے کا رُخ کیا جہاں رمضانی نے میری سائیکل رکھی تھی۔ میں نے اُسے زمین پر لٹا دیا اور پھر پچھلے پہیے کا ٹائر اُتارنے لگا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد جب میں دوبارہ ہوٹل میں آیا تو رمضانی نے ایک کاغذ مجھے دیتے ہُوئے کہا "مالک دے گئے ہیں۔"

"یہ ہوٹل کا بِل تھا۔ میں نے دوبارہ رمضانی کی طرف بڑھا دیا اور کہا "اسے ابھی اپنے پاس ہی رکھیے۔ میری سائیکل کے پچھلے پہیے کی ٹیوب کا بالکل ستیاناس ہو گیا ہے۔ میں پنکچر سمجھا تھا۔ مگر اس میں تو کوئی چھ اِنچ لمبا شگاف ہے۔ یہاں کہیں آس پاس سے نئی ٹیوب نہیں مِل سکتی؟ اس خراب موسم میں تو میں اسے گھسیٹتے ہُوئے دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔"

رمضانی کے چہرے پر گھبراہٹ سی چھاگئی۔ وہ سر کھجانے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہُوئے کہا "مجھے ایک رات اور یہاں قیام کرنا پڑے گا۔ چاند خان کہاں ہیں؟"

"وہ باہر گئے ہُوئے ہیں،" رمضانی نے جواب دیا "چند گھنٹوں کے لیے — وہ یقیناً اِسے پسند نہیں کریں گے۔"

"کیوں نہیں کریں گے؟" میں نے بگڑ کر کہا "وہ رات بھی میرے یہاں ٹھہرنے کو پسند نہیں کر رہے تھے، حالاں کہ ایک کمرا خالی تھا۔"

"مگر وہ آج رات خالی نہیں ہوگا" رمضانی نے کہا "اُن کے

ایک دوست آ گئے ہیں، صبح ہی صبح۔"

"خیر، میں کوئی تکرار نہیں کروں گا" میں نے کہا "مجھے تو رات گزارنی ہے۔ کہیں بھی پڑ کر سو رہوں گا۔"

"میرے لیے تو کوئی فرق نہیں پڑتا" رمضانی نے کہا "چاند خان اِس ہوٹل کے مالک ہیں۔ آپ جانیں اور وہ جانیں۔" یہ کہ کر وہ بڑبڑاتا ہُوا چلا گیا۔

چاند خان اپنے دوست کے ساتھ شام سے ذرا پہلے واپس آیا۔ اُس کا یہ دوست یقیناً آفتاب خان تھا ــــ میں اُنھیں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ مگر اُن کے آنے سے پہلے پہلے میں اپنے کمرے سے نکل کر چاند ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں آ گیا اور ایک پُرانا اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگا۔

چاند خان میرے قریب آیا اور کسی قدر حیرانی سے بولا "آپ ابھی تک یہیں ہیں، مسٹر ارسلان؟"

"جی" میں نے کہا "میری سائیکل کی ایک ٹیوب بالکل جواب دے گئی ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے مزید ایک رات یہاں قیام کرنے کی اجازت دے دیں۔ جگہ کی فکر نہ کریں۔ کہیں بھی پڑ کر سو رہوں گا۔"

چاند خان کچھ سوچتے ہُوئے اپنی ٹھوڑی کھجلانے لگا۔ پھر بولا "ہمیں دُشواری تو یقیناً ہوگی۔ پر خیر، آپ کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ مُہیا کر دیں گے۔ اُوپر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے۔ مگر شاید آپ وہاں آرام سے نہ سو سکیں۔"

اِس کی آپ فکر نہ کریں" میں نے کہا "نیند تو کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے۔"

"کل اِدھر سے ایک ٹرک روشن پُور کی طرف جائے گا" چاند خان کہنے لگا "ہم اپنی ضرُوریات کی چیزیں اُس سے منگواتے ہیں۔ کل وہ یہاں سے گزرے گا تو ہم آپ کو اُس میں سوار کرا دیں گے۔"

"شکریہ، جناب" میں نے کہا "بہت بہت شکریہ۔"

رات کے گیارہ بجے کے قریب رمضانی مجھے اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں لے گیا جس کا ذکر چاند خان نے کیا تھا۔ یہ کوٹھڑی چھوٹی سی تو تھی ہی، اس کی چھت بھی نیچی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ چارپائی بچھی تھی اور دُوسری دیوار میں سلاخوں والی ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ ایک کونے میں ایک کُرسی اور ایک چھوٹا سا میز تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر چارپائی کا رُخ کرنے کی بجائے کُرسی پر بیٹھ گیا۔

شاید مجھے اُونگھ آ گئی تھی کیوں کہ میں یکایک کہیں آس پاس ہی کسی گاڑی کے انجن کی آواز سُن کر چونک اُٹھا تھا۔ میں نے اُٹھ کر آہستگی سے دروازہ کھولا اور کچھ سُننے کی کوشش کی۔ گاڑی کے انجن کی آواز میرے خیال کے مطابق ہوٹل کے پچھلے حصّے سے آ رہی تھی۔ میں کوٹھڑی سے باہر نکل آیا اور اندھیرے میں آہستہ آہستہ راستہ ٹٹولتے ہُوئے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ آخری نچلی سیڑھیاں اُتر کر رُکا اور پھر کچھ سُننے کی کوشش کی۔ بادلوں کی اوٹ میں چھُپے ہُوئے چاند کی مدّھم مدّھم روشنی میں ہوٹل کے پچھلے صحن میں ایک گاڑی نظر آ رہی تھی۔ اُس میں سے دو آدمی ایک تیسرے آدمی کو اُٹھا کر اندر لا رہے تھے۔

میرا دھیان اُسی طرف تھا کہ پیچھے آہٹ سُنائی دی۔ میں مُڑا ہی تھا کہ کوئی چیز دھپ سے آ کر میرے سر پر لگی۔ درد کی لہر میرے سر میں اُٹھی، تارے سے آنکھوں کے سامنے ناچے اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہُوں۔ مگر دُوسرے ہی لمحے جب میں نے آنکھیں

کھولیں تو رمضانی ایک ہاتھ میں خالی جگ لیے کھیسیں نکالتا نظر آیا۔ شاید اُس نے پانی سے بھرا جگ میرے چہرے پر پھینکا تھا۔ میرے حواس اچھی طرح بحال ہُوئے تو چاند خان اور آفتاب خان بھی پاس کھڑے دکھائی دیے۔ میں ایک کُرسی پر رسیوں میں جکڑا ہوا تھا اور آفتاب خان پستول تانے کھڑا تھا۔ اُس کے پیچھے ایک اور آدمی لکڑی کے ایک خالی ڈبے پر بیٹھا تھا۔

"آہا! ہمارا مہمان ہوش میں آگیا ہے!" چاند خان میرے قریب آتے ہُوئے بولا "اب ہم اپنے کاروبار کی طرف دھیان دے سکتے ہیں۔"

"کیا آپ اپنے مہمانوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟" میری آواز غصّے اور تکلیف سے کانپ رہی تھی۔

چاند خان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "مسٹر ارسلان! ہمیں مہمانوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور تم جیسے جاسوس مہمانوں کی تو بالکل ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم تمھاری تمام حرکات پر نظر رکھتے رہے ہیں اور رات جب تم اپنی کوٹھڑی سے باہر آئے تو ہم نے کچھ کارروائی کرنا ضروری سمجھا۔ ہم نے تمھاری سائیکل کا بھی مُعاینہ کیا اور ہمیں پتا چلا اس کے پچھلے پہیّے کی ٹیوب کو چاقو سے پھاڑا گیا ہے ـــ تم یہاں ہماری جاسُوسی کرنے کے لیے کوئی بھی بہانہ بنا سکتے تھے۔ بتاؤ، کس نے بھیجا ہے تمھیں یہاں؟"

یہ کہتے ہُوئے اُس نے ایک تھپّڑ میرے گال پہ جڑ دیا۔ میں بے بسی سے تلملا کر رہ گیا۔ مگر میں نے غصّے اور تکلیف کو ضبط کرتے ہُوئے کہا "کسی نے بھی نہیں۔ میں تو خراب موسم اور سائیکل پنکچر ہو جانے کی وجہ سے یہاں آیا تھا۔"

"اور رات کو اُٹھ کر جاسُوسی کرنے کو کس نے کہا تھا؟"

"کسی نے نہیں" میں نے جواب دیا "وہ تو کسی شور سے میری آنکھ کُھل گئی تھی۔"

بکواس کرتے ہو تم!" چاند خان غرّایا "تم تو بستر پر لیٹے تک نہیں۔"

"کیا فائدہ اِن باتوں کا؟" آفتاب خان نے پہلی بار زبان کھولی "ہماری لانچ صبح روانہ ہو رہی ہے۔"

"بے شک! بے شک!" چاند خان بولا۔ اور پھر وہ اُس شخص کی طرف مُڑا جو لکڑی کے ڈبے پر بیٹھا تھا "دیکھو! ہمارے اس مہمان کو آرام سے لانچ میں سوار کرانا۔"

وہ آدمی اُٹھ کھڑا ہُوا اور یوں مُسکرانے لگا جیسے ساری بات اچھی طرح سمجھ رہا ہو۔ چاند خان آفتاب خان سے بولا "میرا خیال ہے آپ بھی ساتھ چلے جائیں اور ہمارے اس مہمان پر نظر رکھیں۔ ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ میں ذرا شیر خان کو دیکھتا ہُوں۔ ساحلی پولیس کی فائرنگ سے وہ زخمی ہُوا ہے۔"

اِس کے بعد میرے مُنھ میں ایک کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ آفتاب خان اور ڈرائیور نے مجھے اُٹھایا اور ہوٹل کے پچھلے صحن میں لے آئے۔ وہاں ایک ویگن کھڑی تھی۔ اس کا پچھلا دروازہ کھول کر، چاند خان نے ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی اور بولا "یہ پُرانی بوریاں کیا کر رہی ہیں، یہاں؟"

ویگن کے فرش پر پُرانی بوریوں کا فرش بچھا تھا اور ان کا ایک ڈھیر ایک کونے میں بھی لگا ہُوا تھا۔ ڈرائیور بولا "جناب، شیر خان بُری طرح زخمی تھا اور ہم چاہتے تھے کہ اُس کا سفر آرام سے کٹے۔ اِس لیے ہم نے یہ بوریاں یہاں ڈال دی تھیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ سڑکیں کتنی ٹوٹی پھوٹی ہیں۔"

چاند خان میری طرف دیکھ کر مُسکرایا اور بولا "آرام دہ سفر کی ضرورت تو ہمارے اِس مہمان کو بھی ہے۔ ویسے بھی یہ اِس کا آخری سفر ہے۔" یہ کہ کر اُس نے آفتاب خان اور ڈرائیور کے ساتھ مل کر مجھے ویگن کے فرش پر پھینک دیا اور ویگن اُس طرف روانہ ہوگئی جس طرف سے دو راتیں پہلے میں اپنی سائیکل کو گھسیٹتا ہُوا چاند ہوٹل پہنچا تھا۔

ویگن ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتی بھاگی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح اپنی جان بچاؤں۔ میرے مُنھ میں کپڑا ٹھنسا ہُوا تھا اور ہاتھ پاؤں بندھے ہُوئے تھے۔ میں انھی سوچوں میں کھویا ہُوا تھا کہ یکایک کونے میں بوریوں کے ڈھیر میں حرکت سی ہُوئی۔ یہ حرکت ویگن کے ہچکولوں کے باعث نہیں تھی۔ اس کا سبب کچھ اور تھا۔ بوریوں کا ڈھیر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک اُس میں سے ایک ہاتھ نمودار ہُوا اور اُس نے چند بوریوں کو ایک طرف ہٹایا تو مجھے ہوٹل والے لڑکے کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا اور پھر جُھک کر

میرے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کھولنے لگا ـــــ چند منٹ بعد میں آزاد ہو چکا تھا۔ لڑکے نے ایک عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے وہ چھوٹا سا پیچ کش میری طرف بڑھا دیا جو اُس نے میری سائیکل کی ٹوکری میں دیکھا تھا۔

یہ ایک پیچ کش تھا۔ کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مگر کہتے ہیں کہ ہتھیار وہی ہے جو وقت پر کام آئے۔ میں نے پیچ کش سے ہتھیار کا کام لینے کا فیصلہ کیا اور اُسے ڈرائیور کی پیٹھ میں چبھوتے ہوئے رُعب دار آواز میں کہا "گاڑی چلاتے جاؤ اور اِسی طرح آرام سے بیٹھے رہو۔ ذرا بھی حرکت کی تو تم دونوں کی خیر نہیں۔"

ڈرائیور اُسی طرح گاڑی چلاتا گیا اور آفتاب بھی اپنی سیٹ سے چپکا بیٹھا رہا۔ انھوں نے سمجھا ہو گا کہ میرے پاس پستول ہے۔ اب میں لڑکے سے مخاطب ہوا "آفتاب خان کا پستول لو۔ اس کی جیب میں ہو گا۔"

لڑکا پھرتی سے آگے بڑھا اور آفتاب کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔ میں نے وہ پستول لے کر ڈرائیور اور آفتاب دونوں کو اس کی زد میں لے لیا۔ اس کے بعد میں نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ گاڑی کا رُخ روشن پور کی طرف موڑ دے۔ پھر میں نے آفتاب کو اگلی سیٹ سے پچھلے حصے میں آنے کا حکم دیا۔ وہ پچھلے حصے میں آیا تو ہم نے اُس کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ کر ویگن کے فرش پر ڈال دیا۔ اس کے بعد میں نے گاڑی رُکوائی اور ڈرائیور کو بھی باندھ کر گاڑی کے پچھلے حصے میں آفتاب خان کے برابر ڈال دیا۔ چند منٹ بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو میں گاڑی چلا رہا تھا اور وہ لڑکا پستول تھامے آفتاب اور ڈرائیور دونوں کو اپنی زد میں لیے ہوئے تھا۔

روشن پور پہنچ کر میں نے سیدھا تھانے کا رُخ کیا، کیوں کہ میں روشن پور جس انکل کے پاس جا رہا تھا، وہ پولیس انسپکٹر راشد حسین ہی تھے۔ گاڑی تھانے کے اندر داخل ہوئی تو ڈیوٹی پر موجود سپاہی آنکھیں ملتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے گاڑی روکی اور باہر نکل کر اُسے چند لفظوں میں ساری بات بتائی، گاڑی کے پچھلے حصے میں بندھے ہوئے دونوں آدمیوں کو اُس کے حوالے کیا اور اُسے انسپکٹر راشد حسین کو بلوانے کے لیے کہا۔ سپاہی نے آفتاب اور ڈرائیور کو حوالات میں بند کیا اور انسپکٹر راشد حسین کو بلانے چلا گیا۔

اب میں نے پہلی مرتبہ اُس لڑکے کی طرف توجہ کی اور احسان مندی کے بھرپور جذبے کے ساتھ اُس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "میں تمھارا شکریہ کس منھ سے ادا کروں، میرے دوست؟ تمھاری جُرأت نے مجھے موت کے منھ میں جانے سے بچا لیا ہے۔"

وہ ایک غمگین انداز سے مسکرا دیا اور کہنے لگا "میں ذرا جُرأت کرتا تو اس سلیمان کو بھی موت کے منھ میں جانے سے بچا سکتا تھا۔"

"تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ واقعی چاند ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ رجسٹر سے اُس کا نام کُھرچ کر مٹایا گیا تھا ـــــ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سب کچھ جانتے تھے۔"

"ہاں" لڑکے نے جواب دیا "مجھے معلوم تھا کہ چاند خان اور اُس کے ساتھی ہوٹل کے کاروبار کی آڑ میں سمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں۔ مگر مجھے سُلیمان کا انجام اُس وقت معلوم ہُوا جب سمُندر سے اس کی لاش ملی۔ جب میں نے سُنا کہ اس کی لاش تین دِن تک پانی میں رہی ہے تو اچانک مجھے وہ رات یاد آگئی جس رات چاند خان نے مجھے کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اُس رات بھی میں نے ہوٹل کے صحن میں گاڑی کے آنے کی آواز سُنی تھی۔ اِس رات بھی ایسا ہی ہُوا تھا مگر میں اپنے کمرے سے باہر آگیا اور پھر موقع پاکر گاڑی میں پڑی ہُوئی بوریوں کے ڈھیر میں چھُپ گیا۔"

"تم نے بڑی ہمت دکھائی ہے، میرے دوست،" میں نے کہا "لیکن سوال یہ ہے کہ تُم نے ان لوگوں کی سرگرمیوں سے پولیس کو آگاہ کیوں نہیں کیا یا کل ساری بات مجھے کیوں نہیں بتائی؟"

"مجھے چاند خان سے خوف آتا تھا" لڑکے نے سہمے سہمے انداز میں کہا "مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کر دے۔ میں یہاں غیر قانُونی طور پر آیا ہُوں۔"

"غیر قانُونی طور پر؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں" لڑکے جواب دیا "میں بہاری ہُوں اور بنگلہ دیش سے آیا ہُوں۔ ہم محمد پُورہ کیمپ میں رہ رہے تھے۔ میرے والد بلوائیوں کے ایک حملے میں مارے گئے تو میں اور میری ماں چھُپتے چھُپاتے بمبئی پہنچے۔ بمبئی میں ہماری مُلاقات چاند خان کے کارندے شیر خان سے ہُوئی جو لانچ کے ذریعے سمگلنگ اور لوگوں کو چوری چھُپے بمبئی سے کراچی اور کراچی سے بمبئی لانے لے جانے کا کام کرتا تھا۔ یہ شیر خان وہی تھا جسے آج رات زخمی حالت میں چاند ہوٹل میں لایا گیا تھا۔ ہمارے پاس جو تھوڑی بہت جمع پُونجی تھی، وہ ہم نے شیر خان کے حوالے کر دی۔ وہ اپنی لانچ میں ہمیں یہاں لے آیا اور چاند خان کے حوالے کر دیا۔ یہ لوگ ہم ماں بیٹے سے کام تو ڈھیروں کراتے تھے مگر دیتے کُچھ نہ تھے۔ ہر دُوسرے تیسرے روز دھمکی دیتے تھے کہ اگر تُم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تمھیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا اور پولیس تمھیں غیر قانُونی طور پر پاکستان آنے کے جُرم میں جیل میں ڈال دے گی۔ اُس وقت تو ہمیں معلوم نہیں تھا مگر بعد میں ہم پر یہ واضح ہو گیا کہ چاند ہوٹل اصل میں سمگلنگ کا اڈّا ہے۔ مگر ہم خوف کی وجہ سے خاموش رہے۔ لیکن جب پچھلے مہینے میری والدہ کا انتقال ہو گیا تو میری سوچ کُچھ اور ہو گئی۔ پہلے میں اپنی والدہ کے خیال سے خاموش رہتا تھا مگر اب خاموشی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اِس لیے میں موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ خُدا کا شُکر ہے کہ آج میں نے آپ کو سُلیمان جیسے انجام سے دوچار ہونے سے بچا لیا۔ اب مجھے پولیس، پاکستان میں غیر قانُونی طور پر آنے اور رہنے میں جیل بھی بھیج دے تو مجھے افسوس نہیں ہوگا۔"

"تمھیں کوئی جیل نہیں بھیجے گا،" باہر سے ایک آواز آئی۔ میں نے نظریں اُٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا تو انسپکٹر راشد حسین کھڑے تھے۔ وہ کہنے لگے "میں نے تُم دونوں کی ساری باتیں سُن لی ہیں۔"

"اوہ! انکل!" میں خُوشی سے اُچھلتے ہُوئے کہا "تب تو آپ جان گئے ہوں گے کہ اس بہادر لڑکے کی بدولت نہ صرف آپ کا یہ بھتیجا ہلاک ہونے سے بچ گیا بلکہ آپ کے بیٹے سُلیمان کے قاتل بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئے۔"

"ہاں" انسپکٹر راشد حسین بولے "اور جو ایک آدھ باہر ہے۔ وہ بھی جلد ہی جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ جائے گا۔ چاند خان اور شیر خان بھی ابھی تھوڑی دیر میں اپنے دوست اور ساتھی آفتاب خان کے پاس پہنچ جائیں گے۔" پھر اُنھوں نے لڑکے سے پُوچھا "تمھارا کیا نام ہے؟"

"جی ۔ ۔ ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ سُلیمان ہے، جی" لڑکے نے کسی قدر گھبراہٹ سے کہا۔

انسپکٹر راشد حسین نے دونوں باہیں پھیلائیں اور اسے اپنی آغوش میں لیتے ہُوئے بولے "اب تُم میرے پاس رہو گے ـــــ مرحُوم سُلیمان کی طرح میرا بیٹا بن کر۔"

وہ پیار سے اس کے سر کو سہلانے لگے اور اُس نے اُن کے سینے سے یُوں سر لگا لیا جیسے اُسے پھر سے اپنے ماں باپ کی محبت بھری آغوش مل گئی ہو!

تیراکی

سید توقیر حسین شاہ

یونان کے مشہور فلسفی افلاطون کا کہنا ہے کہ "وہ لوگ جاہل ہیں جو تیراکی کے فن سے واقف نہیں۔"

تیراکی کو ہر دور میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے ۔ قدیم مصر کی تاریخ میں اسے ایک اہم ورزش سمجھا جاتا تھا۔ یونان کے بڑے بڑے بادشاہ اور جرنیل اس فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے ۔ کیوں کہ یہ ایک طرح کی جنگی مہارت ہوتی تھی ۔

ایک روایت کے مطابق 1837ء میں انگلستان کے شہر لندن میں تیراکی کے باقاعدہ سوئمنگ پو ل تھے ۔ پھر اسکا شوق انگلستان کے لوگوں میں اس قدر بڑھا کہ 1869ء میں "امیچور سوئمنگ ایسوسی ایشن آف گریٹ بریٹن" قائم ہوئی جس کی نگرانی میں تیراکی کے مقابلے منعقد ہونے لگے ۔

تیراکی کا کھیل شروع ہی سے اولپک کھیلوں میں شامل ہے ۔ پہلے اس میں صرف مرد حصہ لیتے تھے۔1912ء میں خواتین بھی حصہ لینے لگیں ۔ غوطہ خوری کا آغاز 1904ء میں ہوا ۔

تیراکی میں چار طرح کے مقابلے ہوتے ہیں۔پہلے انداز کو "فری اسٹائل" کہتے ہیں ۔ اس میں تیراک تالاب میں پیٹ کے بل لیٹ کر ہاتھوں کی مدد سے پانی کاٹتا ہے ۔ اور ٹانگوں سے بھی مدد لیتا ہے ۔ دوسرا انداز "بیک اسٹروک" کہلاتا ہے۔ اس انداز مں تیراک پیٹھ کے بل لیٹ کر کندھوں کے اوپر سے ہاتھوں کی مدد سے آگے بڑھتا ہے ۔ یعنی اُلٹا تیرنے کو "بیک اسٹروک" کہتے ہیں ۔

تیسرا انداز "بریسٹ اسٹروک" کہلاتا ہے ۔ اس انداز میں تیراک سینے کے بل تیرتا ہے ۔

چوتھا انداز "بٹرفلائی" کہلاتا ہے ۔ اس میں تیراک ہاتھوں کو کندھوں کے اوپر سے گھما کر پانی کو کاٹتا ہوا آگے بڑھتا ہے ۔ لیکن دونوں ہاتھ ایک ساتھ ہی چلتے ہیں ۔ فری اسٹائل کی طرح باری باری نہیں ۔

تمام مقابلوں میں بس یہی چار طرح کے انداز ہوتے ہیں ۔ ان چاروں اندازوں میں ۱۰۰ ، 200 ، 400 ، 800 ، اور 1500 میٹر کے مقابلوں کے علاوہ 100 × 4 اور 200 × 4 میٹر کے مقابلے بھی ہوتے ہیں ۔ جسطرح دوڑ میں 100 × 4 کے مقابلوں میں چار آدمی حصہ لیتے ہیں ، اس طرح تیراکی میں بھی 200 × 4 اور 100 × 4 کے مقابلوں میں چار کھلاڑی ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ انفرادی میڈلے بھی ہوتی ہے ، جسمیں ایک ہی تیراک چاروں طریقوں سے تیرتا ہے ۔ سوئمنگ پول کی ایک طرف کی لمبائی 50 میٹر ہوتی ہے ۔ عام طور پر بیک وقت 8 تیراک حصہ لیتے ہیں ۔

اولمپک میں یہ مقبول ترین کھیل ہے ۔ شروع میں انگلستان کے کھلاڑیوں نے اس کھیل میں برتری قائم رکھی ۔ مگر بعد میں امریکہ اس کھیل میں سب سے آگے نکل گیا ۔ اگرچہ روس، ہنگری ، مغربی جرمنی اور آسٹریلیا کے تیراک بھی اچھے کھلاڑی ہیں مگر مجموعی طور امریکہ کے تیراک سب سے زیادہ مقابلے جیتتے ہیں ۔

ابھی تک سب سے زیادہ اولمپک گولڈ میڈل امریکہ کے "مارک سٹپنز" نے حاصل کئے ہیں۔اس نے ۱۱ گولڈ میڈل جیتے ہیں۔ تیراکی ایک ایسا کھیل ہے جس میں ریکارڈ بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں ۔ اس لئے ہر اولمپک میں نئے ریکارڈ سامنے آتے ہیں ۔

پاکستان میں یہ کھیل مقبول تو ہے مگر ابھی تک بین الاقوامی سطح پر کوئی بڑا کھلاڑی سامنے نہیں آیا ہے البتہ قومی مقابلوں میں سب سے زیادہ میڈل پاکستانی آرمی کے تیراک حاصل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

انوکھا مقدمہ اور نرالا فیصلہ

تقریباً دو ہزار برس قبل از مسیح کی بات ہے کہ بحیرہ مردار کے جنوب میں ایک عجیب و غریب شہر آباد تھا جس کا نام سدوم تھا۔ اس شہر میں منجھے ہوئے بدمعاشوں کی ایک ایسی واہیات قوم آباد تھی جو ہر قسم کی چوری چکاری مار دھاڑ اور اکھڑ پن میں نام پیدا کر چکی تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام اُس وقت کے برگزیدہ نبی تھے۔ انھوں نے اس آوارہ قوم کی اصلاح کے لیے بہتیرے جتن کیے مگر سب بے سُود۔

الیعرض ایک شریف النفس آدمی تھا۔ وہ ایک دفعہ حضرت لُوط علیہ السلام کی خیریت دریافت کرنے کے لیے سدوم آیا۔ وہ ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک ہٹّے کٹّے جاہل نے سامنے سے آکر اُس کے سر پر ایک بڑا سا پتّھر دے مارا۔ بیچارہ الیعرض لہولُہان ہو گیا۔

اِس پر اس گنوار نے الیعرض کا گریبان پکڑ لیا اور بولا: میرے پتّھر سے تمہارا سر سُرخ ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا معقول معاوضہ فوراً ادا کرو! الیعرض ہکّا بکّا رہ گیا اور کہنے لگا: ”ابے باؤلا ہو گیا ہے کیا؟ میرا سر بلاوجہ لہولُہان کر ڈالا ہے اور اوپر سے اس کا معاوضہ مانگتے ہو؟

مگر وہ اکھڑ معاوضے کے مطالبے پر ڈٹا رہا۔ جب تکرار حد سے بڑھ گئی تو اُس نے الیعرض کا گریبان پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹتا ہُوا شہر کی عدالت میں لے آیا۔ اور قاضی صاحب کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔ قاضی نے سارا مقدمہ بڑے غور سے سُنا۔ مگر اصل ملزم کو سزا دینے کی بجائے اُلٹا یہ فیصلہ سُنا دیا کہ الیعرض اپنا سر سُرخ ہونے کا مناسب معاوضہ فوراً ادا کر دے ورنہ اس کے خلاف قانونی کاروائی ہو گی۔

الیعرض پہلے ہی پریشان تھا۔ نرالے قاضی کے نرالے فیصلے سے وہ اور تلملا اُٹھا۔ اُس نے ایک بڑا سا پتّھر اُٹھایا اور قاضی کے سر پر دے مارا۔ قاضی کے سر سے خون کے فوّارے چھوٹنے لگے۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ الیعرض کہنے لگا: جناب عالی! مؤدبانہ گذارش یہ ہے کہ کمترین کے پتّھر سے آپ کا سر سُرخ ہو گیا ہے اس سے کمترین کو کچھ معاوضہ واجب الادا ہو گیا ہے۔ اس معاوضے کی ساری رقم آپ اپنے اس گنوار دعوے دار کو فوراً ادا کر دیں جس نے اسی طرح کمترین کا سر سُرخ کیا تھا اور آپ کے حکم کے مطابق معاوضے کا حق دار ہے۔

یہ کہا اور الیعرض عدالت سے نکل بھاگا اور سدوم کی حدیں پار کر کے ہی دم لیا۔

مقبول انور داؤدی

بھوتوں کا جنگل

کہتے ہیں ایک دفعہ کبوتروں کا ایک بہت بڑا غول ہوا میں اُڑتا جا رہا تھا ۔ یہ غول دانے دُنکے کی تلاش میں تھا ۔ کچھ دیر کے بعد ان کبوتروں نے زمین پر بکھرے ہوئے دانے دیکھے ۔ اُن کے لیڈر کا نام مطوقہ تھا ۔ انہوں نے اپنے لیڈر سے کہا کہ دیکھیں زمیں پر کتنے دانے پڑے ہیں ۔ کیوں نہ یہیں اُتر کر اپنا پیٹ بھر لیں ۔ مطوقہ نے کہا کہ دانے تو مجھے بھی نظر آ رہے ہیں ۔ لیکن اس طرح کے بکھرے ہُوئے دانوں کے متعلق مجھے ڈر ہے کہ کہیں ان کے نیچے جال نہ ہو ۔

کبوتروں نے ایک زبان ہو کر کہا "ہمیں تو بہت بھوک لگی ہوئی ہے ۔ اگر تمہارا جی نہیں چاہتا تو نہ سہی ۔ ہم تو نیچے اُترتے ہیں" مطوقہ نے کہا" اگر تم بغیر سوچے سمجھے اُترنا ہی چاہتے ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ ہُوں "۔

جب یہ کبوتر نیچے اُترے اور دانہ چُگنے لگے تو جال میں پھنس گئے ۔ اب تو لگے پھڑپھڑانے ، مطوقہ نے کہا " بھائیو اس طرح نہ کرو ۔ سب مل کر زور لگاؤ اور جال کو لے اُڑو" ۔

قریب ہی ایک کوّا درخت پر بیٹھا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا- مطوقہ کے مشورے کے مطابق سب کبوتروں نے مل کر زور لگایا اور جال کو لے کر اُڑنے لگے ۔ شکاری نے جب یہ دیکھا تو بہت پریشان ہوا ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کبوتر پکڑنے کی بجائے میرا جال بھی گیا ۔ وہ کچھ دیر تک زمین پر دوڑتا رہا ۔ لیکن آخر تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا ۔ وہ کوّا بھی ان کبوتروں کے ساتھ اُڑنے لگا کہ دیکھوں ان کا انجام کیا ہوتا ہے ۔

کبوتر جال لے کر اُڑے چلے جا رہے تھے ۔ آخر ایک نے مطوقہ سے پوچھا کہ جال تو ہم لے اُڑے ۔ مگر اب اس سے رہائی کیسے نصیب ہو گی ۔ مطوقہ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ گھبراؤ نہیں ۔ تھوڑی دور اس جنگل میں میرا ایک چوہا دوست ہے ۔ وہ ہمیں رہا کر دے گا ۔ آخر وہ جگہ آگئی ۔ کبوتر نیچے اُتر آئے ۔ مطوقہ نے اپنے دوست چوہے کو آواز دی ۔ دوست کی آواز سن کر وہ دوڑ کر اپنے بِل سے باہر آیا اور جب اس نے اپنے دوست مطوقہ کو جال میں گرفتار دیکھا تو بھاگ کر اُس کا جال کاٹنے لگا ۔ مگر مطوقہ نے اُسے روک دیا اور کہا "پہلے میرے ساتھی کبوتروں کو آزاد کرو اور اس کے بعد میرا جال کاٹنا" ۔ چوہا بہت حیران ہوا اور پوچھا "دوست ، ایسا کیوں"؟

مطوقہ نے جواب دیا کہ کبوتر بہت زیادہ ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ تم جال کاٹتے کاٹتے تھک جاؤ گے ۔ لیکن جب تمہیں پتہ ہو گا کہ میں نے اپنے دوست کو بھی رہا کرانا ہے تو تھکے ہونے کے باوجود تم نہیں تھکو گے ۔ چنانچہ چوہے نے جال کاٹ کر سب کبوتروں کو آزاد کر دیا اور وہ سب چوہے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہوا میں اُڑ گئے ۔

کوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا-اُس نے سوچا، چوہا تو ایک اچھا دوست ہے-کیوں نہ اس سے دوستی کی جائے ۔ یہ سوچ کر وہ درخت سے نیچے اُترا اور چوہے کے بِل کے پاس آکر آواز دی کہ چوہے دوست! ذرا باہر آؤ ۔ میں تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں ۔ چوہے نے اندر ہی سے جواب دیا "میاں کوّے میری تمہاری دوستی کیسے ہو سکتی ہے؟ تم تو میرے دُشمن ہو ۔ میں بِل سے باہر آیا تو تم مجھ کو پکڑ کر لے جاؤ گے"۔ کوّے نے قسمیں کھائیں کہ میں تم کو دوست بنانا چاہتا ہوں ۔ آخر بڑی بحث کے بعد چوہا بِل سے باہر آیا اور کوّے نے اس کے ساتھ دوستی کا عہد باندھا ۔ چوہے نے کہا کہ میرا ایک دوست کچھوا بھی ہے ۔ وہ شام کو آتا ہے ۔ میں تمہیں اُس سے بھی ملواؤں گا-ہم ہر روز آپس میں مل کر گپ شپ

مارتے ہیں ۔ شام ہو رہی تھی ۔ کچھوا بھی آگیا ۔ چوہے نے کوّے اور کچھوے کو آپس میں ملایا اور کہا کہ اب ہم دو کی بجائے تین دوست ہو گئے ہیں ۔ اب فارغ وقت میں خوب گپ شپ ہوا کرے گی ۔

یہ تینوں دوست دن بھر تو اپنی روزی کی تلاش میں رہتے اور شام کو مِل بیٹھتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور اپنا جی بہلاتے ۔

ایک دن یہ تینوں دوست بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ ایک زخمی ہرن ہانپتا کانپتا اُن کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے ایک شکاری نے تیر مار کر زخمی کر دیا ہے ۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ میرا پیچھا نہ کر رہا ہو۔چوہے نے اُسے تسلی دی کہ تم فکر نہ کرو ۔ اب تم خطرے سے باہر ہو ۔ یہاں کوئی شکاری نہیں آئے گا ۔ اس پر ہرن نے سُکھ کا سانس لیا اور اُن کے پاس ہی رہنے لگا ۔ اب یہ تین کی بجائے چار دوست تھے ۔

ایک مدت تک ان کی دوستی چلتی رہی ۔ لیکن ایک شام جب تینوں دوست جمع ہوئے تو ہرن نہ آیا ۔ ان تینوں کو پریشانی ہوئی ۔ چوہا کہنے لگا "یار کوّے، تم اُڑ کر پتہ تو کرو کہ ہرن کہاں ہے" کوّا اُڑا اور تھوڑی دیر کے بعد خبر لایا کہ وہ تو ایک جال میں پھنسا ہوا ہے ۔

چوہے نے کہا کہ کوّے، تم میری دُم چونچ میں پکڑو اور مجھے وہاں لے چلو تاکہ ہرن کو آزاد کرایا جائے ۔ کوّا چوہے کی دُم پکڑ کر اُڑا اور جلد ہی چوہے کو اُس جگہ پہنچا دیا جہاں ہرن پھنسا ہوا تھا ۔ کچھوے نے دیکھا کہ وہ تو چلے گئے مجھے بھی دوست کی مدد کے لیے وہاں جانا چاہیے اور وہ چل دیا ۔

چوہے نے ہرن کے جال کو کاٹنا شروع کر دیا ۔ جب چوہا جال کاٹ چُکا تو عین اُس وقت کچھوا بھی وہاں پہنچ گیا ۔ سب نے کہا کہ تم کیوں آ گئے؟ کچھوے نے کہا کہ میں بھی تمہارا دوست ہوں۔میں کیسے پیچھے رہ سکتا تھا ؟

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ شکاری بھی آگیا ۔ کوّا تو اُڑ کر درخت پر جا بیٹھا، چوہا جھاڑیوں میں چُھپ گیا اور ہرن بھاگ گیا ۔ شکاری نے جب اپنا جال کٹا ہوا دیکھا تو اُسے بہت دُکھ ہوا۔اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اُسے کچھوا نظر آیا ۔ اُس نے سوچا کہ یہ سب شرارت کچھوے کی ہے ۔ اُس نے کچھوے کو پکڑ کر اپنے تھیلے میں ڈال لیا ۔

باقی تینوں دوست یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے ۔ شکاری چل دیا تو تینوں دوست جمع ہو گئے اور سوچنے لگے کہ کچھوے کو کس طرح بچایا جائے ۔ ہرن نے کہا کہ میں لنگڑا کر چلتا ہوں کوّا میری پیٹھ پر ٹھونگے مارے ۔ شکاری سمجھے گا کہ ہرن زخمی ہے ۔ میں اسے پکڑ لوں گا۔چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا ۔ شکاری اپنا تھیلا زمین پر رکھ کر ہرن کے پیچھے بھاگا ۔ چوہا دوڑ کر تھیلے کے پاس آیا ۔ اور تھیلا کاٹنا شروع کر دیا ۔ اس مدت میں شکاری اور ہرن میں آنکھ مچولی ہوتی رہی ۔ آخر جب ہرن کو یہ پتہ چلا کہ کچھوا آزاد ہو چکا ہے تو اس نے چوکڑی بھری اور کوّا اُڑ گیا ۔ شکاری جب ناکام ہو کر واپس ہوا تو اس کا تھیلا کٹا ہوا تھا اور کچھوا غائب ! شکاری جان بچا کر بھاگا ، وہ بلند آواز میں کہتا جا رہا تھا:

"شکاریو! اس جنگل میں نہ آنا ۔ یہاں بُھوت بستے ہیں" ۔

ہیبت ناک گوریلا

مقبول جہانگیر

شام ہی سے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور میں اور میرا دوست ارشد اِس اِنتظار میں تھے کہ کب یہ رُکے اور کب ہم بوڑھے شکاری کے گھر جا کر شکار کی کوئی دِل چسپ کہانی سُنیں۔

جُوں ہی بارش رُکی ، ہم بھاگے ہوئے شکاری کے گھر گئے ۔ وہ پلنگ پر کمبل اوڑھے لیٹا تھا ۔ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھا اور بولا " آؤ بھئی، آؤ ۔ میں تمہارا ہی اِنتظار کر رہا تھا۔" ہم شُکریہ ادا کر کے بیٹھ گئے ۔

اچانک میری نظر اُس کمبل پر پڑی جو شکاری نے اوڑھ رکھا تھا ۔ اُف خُدایا! یہ کمبل کیا تھا ، کسی خوفناک جانور کی کھال تھی، جِس پر لمبے لمبے گھنے بال تھے !

میں غور سے اُس عجیب وغریب کمبل کو دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس جانور کی کھال ہو سکتی ہے ۔ کوئی بہُت ہی لمبا تڑنگا درندہ ہو گا ، جبھی تو اُس کی کھال اِتنی لمبی چوڑی ہے کہ کمبل کا کام دے سکتی ہے!

بوڑھے شکاری نے بھانپ لیا کہ ہم اُس کا کمبل دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں ۔ وہ ہنس کر کہنے لگا " اوہو! تُم اِس کھال کو دیکھ کر تعجب کر رہے ہو؟ ارے بھئی یہ گوریلے کی کھال ہے ۔"

"گوریلا؟ وُہی نا جِسے بن مانس بھی کہتے ہیں" میں نے چلّا کر کہا "یہ آپ کو کہاں سے مِلی؟"

"مِلتی کہاں سے" شکاری بولا "افریقہ کے جنگلوں میں گوریلے بے شمار ہیں ۔"

"تو آج اِسی گوریلے کی کہانی ہو جائے" ارشد نے بڑے اشتیاق سے کہا ۔ بوڑھے شکاری نے گلا صاف کیا اور پھر کہنے لگا " یہ آج سے تقریبًا 50 سال پہلے کی بات ہے ۔ اُن دِنوں میں افریقہ کے ایک مُلک کانگو میں شکار کے لئے گیا ہوا تھا ۔ وہاں اتّفاق سے مجھے دو انگریز شکاری مِل گئے جو گوریلوں کے شکار کے لئے آئے تھے ۔ ایک کا نام "جیک" تھا اور دوسرے کا "پیٹر۔" اُنہوں نے جب یہ سُنا کہ میں بہت تجربہ کار شکاری ہوں تو مجھے بھی اپنے ساتھ شامِل کر لیا ۔ ہمارے ساتھ ایک حبشی راہ نُما بھی تھا جس کا نام "مکھا رورو" تھا ۔

چند روز بعد ایک حادثے میں ہمارا ایک ساتھی جیک سخت زخمی ہو گیا۔ اُسے ہم ایک قریبی قصبے میں لے گئے اور وہاں ہم نے چند ہفتے اُس کا علاج مُعالجہ کیا ۔ اور جب وہ صحّت یاب ہو گیا تو ہم گوریلوں کے شکار کے لئے آگے چل پڑے ۔

گوریلے کانگو کے جنگلوں کے وسط میں رہتے ہیں ۔ اور یہاں تک کسی شکاری کا بہ حفاظت پہنچ جانا ناممکن نہیں تو مُشکل ضرور ہے ۔ یہاں قریب ہی ایک جِھیل ہے ، جس کے

کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے ۔ اِس گاؤں کا سردار ہمارے اِستقبال کے لئے آیا اور ہماری بڑی خاطر مُدارات کی ۔ گاؤں کے لوگوں نے کبھی کسی سفید چمڑی والے کو نہیں دیکھا تھا ۔ وہ ہمیں دیکھ کر حیران ہو رہے تھے ۔

میں وہ دِن کبھی نہیں بھولوں گا جس دِن ہمیں زمین پر گوریلوں کے پیروں کے نِشان دِکھائی دیے ۔ ہم حیرت اور خوف سے اِن نشانوں کو دیکھ رہے تھے ، جو بالکل انسانی قدموں کے نشانوں کی طرح تھے ۔

اُس وقت ہمارے جوش کا کُچھ ٹھکانا نہ تھا ۔ ہم نے اپنی رائفلیں سنبھالیں اور نشانوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے ۔

"خُدا کی پناہ ! کتنا خوف ناک اور ہولناک مقام ہے " جیک نے آہستہ سے کہا "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم دُنیا کے آخری کنارے پر آ گئے ہیں ۔" ایک قطار کی شکل میں چلتے ہوئے ہم جنگل کے اس حصّے میں پہنچے جہاں بالکل گھُپ اندھیرا تھا ۔ اور گھنے درختوں اور جھاڑیوں کی کثرت کی وجہ سے راستہ قریب قریب بند ہو گیا تھا ۔ ہم بڑی مشکل سے اُن کے درمیان سے گذر سکتے تھے ۔

اچانک مکھا رو رو نے ایک عجیب سی آواز نکالی اور اِس طرح اُچھلا جیسے کوئی خاص بات دریافت کی ہو ۔ ہم سب ایک دم رُک گئے اور سانس روک کر اُس کی طرف دیکھنے لگے ۔

"کیا بات ہے ؟" جیک نے آہستہ سے پوچھا ۔

جبشی نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر کان لگا کر کچھ سُننے کی کوشش کرنے لگا ۔ وہ ایسا لگتا تھا جیسے سیاہ رنگ کا کوئی بُت زمین میں گڑا ہُوا ہو ۔ اور پھر اچانک یُوں معلوم ہوا جیسے کچھ فاصلے پر درختوں کی ٹہنیاں ٹُوٹ رہی ہوں ۔

"یہ ضرور گوریلا ہے " مکھارورو نے سرگوشی میں کہا ۔

"ہم کیا کریں؟" پیٹر نے اُس سے پُوچھا ۔

"ہمیں احتیاط سے چلنا چاہیے " جبشی بولا "چُپ چاپ میرے پیچھے چلے آئیے اور رائفلیں تیار رکھیے ۔"

مکھا رورو کے پیچھے چلتے ہوئے ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں شاخیں ٹُوٹنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں ۔ یہاں پہنچ کر ہمارے قدم خُود بہ خُود رُک گئے ۔

"یہ گوریلا کیا کر رہا ہے؟" میں نے جبشی سے پُوچھا ۔ "شاید کھانے کے لئے درختوں کی نرم نرم ٹہنیاں توڑ رہا ہے " جبشی نے جواب دیا ۔

اچانک جیک بولا "وہ دیکھو! اُس طرف کھُلی جگہ میں ، جھاڑیوں کے درمیان کالی کالی کوئی چیز نظر آ رہی ہے ۔ یہ گوریلا تو نہیں؟"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے" پیٹر رائفل سنبھالتے ہوئے بولا ۔ اسی وقت مکھا رورو نے ایک دفعہ پھر منہ سے وُہی عجیب آواز نکالی اور بولا " یہ گوریلا ہی ہے ۔ جلدی کیجئے ۔ نشانہ لگائیے اور فائر کر دیجئے "

یہ سُن کر پیٹر نے اپنی رائفل سیدھی کی ۔ ہم سب میں اُس کا نِشانہ بہترین تھا ۔ اس نے بڑی احتیاط سے گوریلے کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی ۔ دھائیں !

خدا کی پناہ! میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی خوف ناک اور دِل ہلا دینے والی چیخیں نہیں سُنیں ، جو اس روز گوریلے کے مُنہ سے نکل رہی تھیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کئی شیر مِل کر دہاڑ رہے ہوں ۔ ہمارے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے ۔ میرے بچّو! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ چیخیں کیسی ہولناک تھیں ! بس یُوں سمجھ لو کہ اگر کوئی معمولی دِل گردے کا آدمی سُن لیتا تو مارے دہشت کے مر جاتا ۔

ہم سب بید کی طرح کانپ رہے تھے اور مارے خوف کے ہماری زبانیں گنگ ہو گئی تھیں ۔ بڑی دیر تک ہم اِسی طرح بے حِس و حرکت کھڑے رہے۔ ہمیں اُمید تھی کہ غضبناک گوریلا اب ہم پر حملہ کرے گا ۔ لیکن جب وہ اپنی جگہ سے نہ ہِلا تو جیک نے چلّا کر کہا "آؤ۔ اگر یہ ہم پر حملہ نہیں کرتا تو ہم خود اس پر حملہ کریں ۔"

جیک کی آواز سُن کر باقی لوگوں کو ہوش آیا اور ہم سب زخمی گوریلے کی طرف بڑھے ۔ وہ زمین پر بیٹھا بُری طرح چیخ رہا تھا اور طیش کے عالَم میں کبھی اپنے نکیلے دانتوں سے اپنے آپ کو کاٹنے لگتا ، کبھی پنجوں سے زمین کھرچتا ، اور کبھی غُصّے سے اپنے سینے پر اتنے زور زور سے ہاتھ مارتا کہ اُس میں سے ڈھول کی طرح ، ڈھم ڈھم کی سی آواز نکلتی ۔

اب ہمیں معلوم ہوا کہ اُس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور وہ بھاگ نہیں سکتا ۔ ہمیں دیکھتے ہی اُس نے اِتنے زور کی چیخ ماری کہ سارا جنگل لرز گیا، اور اس کے ساتھ ہی وہ زور لگا کر اُوپر اٹھا ۔ اس کا مقصد ہم پر حملہ کرنا تھا "جیک ! خبردار!" ہم نے ایک ساتھ چلّا کر کہا ۔

جیک اپنی جگہ چٹان کی مانند کھڑا تھا۔ اُس نے فوراً ہی رائفل سیدھی کی اور گولی چلا دی ۔ لیکن جلدی میں اس کا ہاتھ ہل گیا اور نشانہ خطا ہو گیا ۔ اس پر میں نے اندھا دُھند دو فائر کیئے جس سے گوریلے کا سینہ چھلنی ہو گیا اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح دھڑام سے زمین پر گر پڑا ۔

جب ہم نے اس خوفناک گوریلے کو قریب سے دیکھا تو ہمارا جسم کپ کپا اُٹھا ۔ قُدرت نے کیسے کیسے خوفناک جانور پیدا کیے ہیں ۔ اس کا قد پانچ فُٹ چھ انچ تھا اور چھاتی کی چوڑائی چار

فٹ دو انچ کے قریب تھی ۔ تمام جسم پر گہرے بھورے رنگ کے بال تھے ۔ لیکن چھاتی بالوں سے خالی تھی ۔ آنکھیں چھوٹی اور زرد رنگ کی تھیں ۔

میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا تو خوف سے بدن میں تھرتھری پیدا ہو گئی ۔ اس کا چہرہ اِنسان سے مِلتا جُلتا تھا ۔ مگر ایسا ڈراؤنا کہ کم زور دِل کے آدمی تو دیکھتے ہی اللہ کو پیارے ہو جائیں ۔ چوں کہ اس کی لاش اُٹھا کر لے جانا ہمارے بس کی بات نہ تھی، اس لیے ہم نے اُس کی کھال اُتار لی جو میرے حصّے میں آئی کیوں کہ وہ میری ہی گولیوں سے مرا تھا ۔ پیٹر اور جیک نے اس کی کھوپڑی اور جسم کے بعض حصّوں کی ہڈّیاں لے لیں ۔

یہاں پہنچ کر بوڑھا شکاری خاموش ہو گیا اور دُور خلا میں گھورنے لگا ، جیسے پرانی باتیں یاد کر کے دل ہی دل میں لُطف اُٹھا رہا ہو ۔ میں کھانسا تو وہ چونک پڑا ۔ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مُسکراہٹ بِکھر گئی ۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "ہا ! وہ بھی کیا دن تھے! اب بھی یاد آتے ہیں تو دِل مچل جاتا ہے ۔"

یہ دُوسری یا تیسری بس تھی جو ہمیں دیکھ کر رُکنے کی بجائے اسی تیز رفتاری سے سٹاپ سے آگے نکل گئی ۔ غُصّے سے پہلے ہی بھرے ہوئے تھے ، اس واقعے نے اور بھی موڈ آف کر دیا ۔

اب جُوں ہی اگلی بس آتی دِکھائی دی ، ہم سب ، جو بیس سے کم نہیں تھے ، اپنی اپنی ہاکیاں سیدھی کر کے سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہوگئے ۔ ڈرائیور کو بس روکتے ہی بنی وہ کر بھی کیا سکتا تھا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب لڑکے بس کی باڈی پر ہاکیاں برساتے ، مردہ باد کے نعرے لگاتے ، چھت پر چڑھ گئے ۔

بس چلنا شروع ہوئی تو چھت پر بیٹھے لڑکوں نے طرح طرح کی حرکتیں کرنی شروع کر دیں ۔ دوچار قوّالی کے انداز میں گانے لگے ۔ باقیوں نے کچھ دیر پہلے کھیلے گئے ہاکی میچ اور اس میں ہارنے کی وجوہات پر تبصرہ شروع کر دیا ۔ مگر سب سے نرالی حرکت سجّاد نے کی ۔ حالانکہ وہ ٹیم کا کپتان تھا ۔ کم از کم اسے یہ حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی ۔ بلکہ کوئی اور ایسی حرکت کرتا تو اسے منع کرنا اس کا فرض تھا ۔ اس نے چھت پر پڑی بوریوں کو ٹٹول کر دیکھا اور پھر ایک بوری کھول کر زور سے نعرہ لگایا ۔ یہ خوشی کا نعرہ تھا ۔ کیوں کہ بوری میں کسی باغ سے توڑے گئے امرود اور مالٹے بھرے ہوئے تھے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے سبھی لڑکے یاجوج ماجوج کی طرح بوری پر ٹوٹ پڑے اور منٹوں میں اس کا صفایا کر دیا ۔ اب بوری میں چند چھوٹے چھوٹے کچّے امرود اور پتّے ہی باقی بچے تھے ۔

جب ہم چشتیاں کے اڈّے پر اُترے تو سبھی کے پیٹ بھرے ہوئے تھے ۔ چہرے پر مسکراہٹیں سجائے ، قہقہے لگاتے نیچے اُترے اور سکول کی جانب روانہ ہوگئے ۔ چند ایک لڑکوں کے ہاتھوں میں مالٹے اور چند کے ہاتھوں میں گڑ تھا ۔

میں حالانکہ اس کام میں تقریباً برابر کا شریک رہا تھا مگر ایک تو یہ میرا پہلا موقع تھا ۔ دوسرے مجھے یہ کام چوری سے ملتا جلتا لگ رہا تھا ۔ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی کوئی چیز اٹھائی جائے تو وہ چوری ہی ہوتی ہے ۔ اس لئے مجھے کئی دفعہ افسوس بھی ہوا ۔ مگر سبھی لڑکے کر رہے تھے اس لئے یہ غلط کام میں بھی ہنسی خوشی کرتا رہا ۔

سکول پہنچے تو آخری پیریڈ شروع ہوا تھا ۔ ہاکی ٹیم کے انچارج بشیر صاحب گیٹ سے کچھ دور لان میں ساتویں کلاس لے رہے تھے ۔ سجّاد اور رضا نے انہیں جھوٹی سچّی رپورٹ سنائی کہ سَر ، بخش خاں سکول والوں نے بڑی بے ایمانی کی اور میچ میں ہمیں ہرا دیا ۔ بشیر صاحب نے مُسکراتے ہوئے پوچھا "بھئی کتنے درجن گول ہوئے ؟" اب گول تو کُل تین ہوئے تھے ۔ وہی سجّاد نے بتلا دئے ۔ بشیر صاحب بولے "بھئی واہ یہ بھی کوئی ہار ہے ۔ بس حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے ۔" اس کے بعد انہوں نے سجاد سے کہا کہ سکول کا سامان اور کِٹیں وغیرہ ان کے کمرے میں رکھ آئے ۔ مجھے انہوں نے روک لیا ۔ "ہاں بھئی خالد" انہوں نے مجھ سے پوچھا "سناؤ ۔ کیسا رہا میچ اور تم نے کیسی کارکردگی دکھائی ؟"

میں چونکہ بشیر صاحب کی کلاس میں پڑھتا تھا اور انہی کی خواہش اور اصرار پر میں نے ہاکی شروع کی تھی، اس لئے وہ آزادی سے میرے ساتھ بات چیت کرتے تھے۔ باقی کلاس کے لڑکے بھی کتابیں بند کر کے اب ہماری طرف متوجہ تھے۔ آخری پیریڈ میں ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی معجزہ ہو جائے۔ بشیر صاحب کا کوئی مہمان آجائے یا انہیں ہیڈ ماسٹر صاحب بُلا لیں تاکہ اگلے روز کے ڈھیروں ہوم ورک سے بچ جائیں۔

میں مخمصے میں تھا کہ کیا بتلاؤں اور کیا چُھپاؤں کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا قاصد بشیر صاحب کو بُلانے کے لئے آگیا۔ انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور دفتر کی طرف چل دئے۔ وہ مجھ پر ہمیشہ اعتماد کرتے اور سچّی بات کی توقع رکھتے تھے۔ مگر آج مجھ سے کچھ کہا نہیں جا رہا تھا۔

اسی اثنا میں ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے تک پہنچ گئے۔وہ برآمدے میں دو آدمیوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے اور ان میں سے ایک بخش خاں ہاکی سکول کے پی۔ ٹی ماسٹر تھے۔ میرے پاؤں تلے سے زمیں نکل گئی۔ "دیکھ لیا، بشیر صاحب آپ نے اپنے چہیتوں کا کارنامہ؟ ہمارے سکول کی محنت اور نیک نامی پر مِنٹوں میں پانی پھیر دیا۔ یہ تربیت دی تھی آپ نے انہیں؟ اِسی ٹیم پر آپ کو ناز تھا؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب شاید کچھ اور بھی کہتے کہ بشیر صاحب بولے "سر، ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے، صِرف تین ہی تو گول ہوئے ہیں۔ آئندہ انشاءاللہ ۔۔۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے غُصّے سے بات کاٹی "بھاڑ میں گئے تین گول۔ پتا ہے یہ شہزادے وہاں کیا گُل کھلا کر آئے ہیں؟"

"نہیں، سَر۔ میں ابھی خالد سے پوچھنے ہی والا تھا کہ آپ کا پیغام آگیا۔ اسی سے پوچھ لیتے ہیں" بشیر صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ کیا بتلائے گا؟ یہ بخش خاں سکول کے پی۔ ٹی ماسٹر صاحب ہیں۔ اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب کا خصوصی پیغام لائے ہیں۔ انہی سے سُن لیں ان صاحبزادوں کے کارنامے کی تفصیل۔"

پی۔ ٹی ماسٹر صاحب نے بولنا شروع کیا تو میرا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شرمندگی سے سر جُھکا ہوا تھا اور کھیلے جانے والے میچ کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔

"بشیر صاحب، آپ کے لڑکوں نے میچ کے آخری لمحوں میں ہمارے تین لڑکوں کو نہ صرف جان بوجھ کر شدید زخمی کیا بلکہ میچ ہارنے کے بعد انہوں نے ہُلّڑ بازی بھی کی اور گراؤنڈ سے سکول گیٹ تک سبھی گملوں اور زیبائشی پودوں کو توڑ پھوڑ دیا۔"

وہ ہماری حماقتوں کی تفصیل بتا رہے تھے اور میں زمین کُرید تا ہوا سوچ رہا تھا کہ میں، جس نے بڑی محنت سے اساتذہ کی نظروں میں اپنا مقام بنایا تھا۔ ٹیم کے ساتھ غلط کام میں شرکت کے باعث سب کچھ لمحوں میں کھو بیٹھا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ شرمندگی سے بڑا عذاب اور کوئی نہیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے ساری ٹیم کو سخت سزا دینے کا فیصلہ سنایا۔ جُرمانے کا بھی اور کھیل پر پابندی کا بھی۔ اور سب سے اذیّت ناک بات یہ کہ بشیر صاحب، جو ہمیں اپنے بچّوں کی طرح پیار کرتے تھے ہم سے روٹھ گئے۔ انہوں نے سب کے سامنے سزا کے طور پر ہمیں دو بید لگائے اور پھر خود بھی رو دیے۔

سزا بُھگت کر ہمیں غُصّہ آنے کی بجائے ان پر بہت پیار آیا اور اپنے کئے پر ندامت بھی ہوئی۔

چُھٹّی کے بعد میں گھر پہنچا تو خاصی چہل پہل تھی۔ بڑے اہتمام سے کھانے پک رہے تھے۔ ابّو جی ابھی دفتر سے نہیں آئے تھے۔ چچی جان اور ان کی بیٹی نوشی آئے ہوئے تھے۔ سکول میں ملنے والی سزا کے بعد مہمانوں کو دیکھ کر خُوشی

ہوئی کہ چلو اب چچا چچی اور نوشی سے گپ شپ ہوگی ۔

خیر خیریت سُننے سُنانے کے دوران ہی ابّو جی آ گئے اور چچا جان نے انہیں بتایا کہ وہ اپنے باغ سے تازہ امرود اور کنّو کی دو بوریاں لے کر آئے تھے تاکہ بچّے چند روز خوب مزے کر لیں ۔ مگر بُرا ہو تمہارے شہر کے نامعقول لڑکوں کا وہ سب کچھ ہڑپ کر گئے۔ نہ جانے کیسے والدین ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کی ایسی تربیت کی ہے ۔

اگلے روز دوسرے پیریڈ میں ہاکی ٹیم اور اس کے ساتھ جانے والوں کو ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف سے پھر بُلاوا آگیا ۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیوں بلایا گیا ہے ؛ سزا تو کل مِل چکی تھی ۔ اور پھر مجھے تو گھر جا کر دوہری ذہنی سزا مِلی تھی ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے باہر ہم سب چُپ چاپ کھڑے آنے والے مشکل لمحوں کا انتظار کر رہے تھے ۔ کمرے سے دو تین آوازیں بار بار بلند ہو رہی تھیں ۔ چند جملے باہر تک بھی آجاتے اور ہم خوف سے لرز جاتے ۔ کوئی کہہ رہا تھا " ہیڈ ماسٹر صاحب ؛ میرا بیٹا بھی یہیں پڑھتا ہے ۔ خُدا کی قسم اگر وہ ایسی حرکت کرتا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دیتا ۔ یہ سکول ہے ۔ مگر یہاں تعلیم کے نام پر چوری سکھائی جا رہی ہے ۔ ذرا ہمیں ان فنکاروں کا دیدار تو کروائیں ،،

اتنے میں ایک اور آواز اُبھری " جناب ؛ یہ تو پولیس کیس ہے ۔ ہم نے اس روٹ پر بسیں پھر بھی چلانی ہیں ۔ ایسا ہونے لگا تو ہم کدھر جائیں گے ؟ اب تو یہ کیس پولیس میں ہی جائے گا ۔" میں جان بوجھ کر سب سے آخر میں ایک ستون کے ساتھ کھڑا ہو گیا ۔ کمرے سے نِکلنے والوں میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے ساتھ میرے چچا ، والد صاحب اور بس کے کنڈیکٹر اور ڈرائیور بھی تھے ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی جتنی بے عزّتی ہوئی تھی ان کا بس چلتا تو ہمیں کچّا چبا جاتے ۔ غصہ ان کے چہرے، ہاتھوں اور آنکھوں سے اُبل رہا تھا ۔

اچانک چچا جان کی نظر مجھ پر پڑی ۔ انہوں نے بڑے پیار سے مجھے آواز دی اور بڑے فخر سے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بولے "جناب ، دیکھئے ۔ میرا یہ بھتیجا بھی تو آپ کے سکول میں پڑھتا ہے ۔ کبھی اس نے ایسی گھٹیا حرکت کی ہو تو بتایئے ۔ ہم ابھی کھڑے کھڑے اس کو سکول سے اُٹھالیں گے ۔"

زمیں پر چکرا کر گرنے سے پہلے میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور میں اُس آواز کا منتظر تھا کہ "جناب یہ بھی تو ان میں شامل تھا ۔"

حج کا زمانہ تھا ۔ اِسلامی مملکت کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے لوگ عرفات کے میدان میں جمع تھے ۔ مُسلمانوں کے دُوسرے خلیفہ حضرت عُمر رضی اللہ عنہ نے تمام صوبوں کے گورنروں کو حُکم دیا تھا کہ وہ حج کے موقع پر اُن سے ملیں ۔ چُنانچہ تمام گورنر بھی موجود تھے ۔ حضرت عُمرؓ تقریر کے لیے کھڑے ہُوئے ۔ خداوند تعالٰی کی تعریف اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وصلوٰۃ کے بعد آپ نے فرمایا :

"لوگو ! میں نے اپنے گورنروں کو آپ کے پاس اِس لیے بھیجا ہے کہ ایمان داری کے ساتھ تُمہارے معاملات کی دیکھ بھال کریں ۔ اِس لیے نہیں کہ تمہاری جان و مال اور عزت و آبرو سے کھیلیں ۔ اگر کسی شخص پر میرے کسی گورنر نے کوئی ظلم کیا ہے تو وُہ کھڑا ہو جائے"۔

پُورے مجمعے میں سنّاٹا چھا گیا ۔ دُور دُور تک کوئی شخص کھڑا دکھائی نہ دیتا تھا ۔ آخر ایک شخص آہستہ آہستہ اُٹھا اور اُس نے کہا "یا امیر المومنین ! آپ کے گورنر نے مجھے بے قصور سو کوڑے مارے تھے"۔

حضرت عُمرؓ نے اُس گورنر سے دریافت کیا تو اُس نے اپنا قصور مان لیا ۔

آپ نے فریادی سے کہا "اگر تُم بدلہ لینا چاہتے ہو تو آگے آؤ اور اِس کے کوڑے مارو"۔

سب لوگ چُپ چاپ بیٹھے تھے ۔ کسی میں بولنے کی ہمّت نہ تھی ۔ فریادی کے ہاتھ میں کوڑا دے دیا گیا ۔ یہ دیکھ کر مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ نے عرض کی "یاامیر المومنین ہمیں اِجازت دیجیے کہ ہم اِس شخص کے ساتھ راضی نامہ کرلیں"۔

حضرت عُمرؓ نے فرمایا "اگر یہ کسی بات پر راضی ہو جاتا ہے تو مجھے کوئی اِعتراض نہیں"۔

گورنروں نے اُس شخص کو گھیر لیا اور بڑی مِنّت سماجت کے بعد وہ فی کوڑا دو دینار کے حساب سے دوسو دینار لینے پر رضا مند ہوگیا ۔ حضرت عُمرؓ نے گورنروں سے کہا "تم لوگوں کو ذلیل و خوار نہ کرو ۔ اُن کی حق تلفی کرکے اُنہیں کُفر کی طرف مت دھکیلو اور انہیں لے کر جنگلوں اور دلدلوں میں نہ گھسو کہ وہ تباہ و برباد ہو جائیں"۔

پُراسرار پرندہ

آغا شیدا کاشمیری

جاپان کے ایک گاؤں میں ایک نوجوان لڑکا رہتا تھا جِس کا نام ٹوکو تھا۔ ایک دفعہ سردی کے موسم میں برف اتنی گر رہی تھی کہ پوری فضا دُھندلا گئی تھی اور لوگوں کو گھروں میں بند رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایسے میں ٹوکو سَر پر لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے جا رہا تھا۔ سردی بہت زیادہ تھی اور اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر اپنے آپ کو گرم کر سکے۔ چاروں طرف برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔اِس سکوت اور سنّاٹے میں اُسے پھڑ پھڑانے کی آواز آئی اُس نے مُڑ کر دیکھا تو ایک خوبصورت پرندہ برف پر پڑا نظر آیا۔ وہ شاید کسی منڈیر یا دیوار سے ٹکرا کر گر گیا تھا اور شدید سردی میں اس سے دوبارہ اڑا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بُری طرح سردی سے کانپ رہا تھا۔ ٹوکو کو اس معصوم پرندے پر بڑا رحم آیا۔ اس نے لکڑیوں کا گٹھا برف پر رکھ کر پرندے کو اُٹھایا اور اپنے کوٹ کے اندر چُھپا لیا تاکہ سردی سے بچ سکے۔ ٹوکو اسے تسلّی دینے لگا کہ پیارے پرندے گھبراؤ مت میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تھوری دیر بعد پرندہ اُڑنے کے قابل ہو گیا۔ ٹوکو نے اُسے چھوڑ دیا اور وہ آہستہ آہستہ اُڑتا ہوا دُور نکل گیا۔

جب پرندہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو ٹوکو نے لکڑیوں کا گٹھا اٹھایا اور گھر کی جانب تیزی سے روانہ ہو گیا جہاں اُس کے والدین اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

کئی ہفتے گذر گئے سردی کی شِدّت ختم ہو گئی، پہاڑوں میں جمی ہوئی برف پگھلنا شروع ہو گئی، درختوں میں نئی نئی کونپلیں نِکلنے لگیں، اور خوبصورت پُھول کھلنے لگے۔

ایک دِن ایک خوبصورت سی لڑکی ٹوکو کے گھر آئی۔ اُس وقت ٹوکو اور اس کا والد کھیتوں میں گئے ہوئے تھے صِرف ٹوکو کی والدہ گھر پر تھیں۔ اس لڑکی نے ٹوکو کی امّی کو اپنا نام یَن بتایا اور کہا کہ میرے والدین کا انتقال ہو چُکا ہے۔ میں اپنے ماموں کے پاس جا رہی تھی کہ راستہ بھول گئی۔اگر آپ اجازت دیں تو کچھ روز میں آپ کے ہاں قیام کر لوں؟

ٹوکو کی والدہ بڑی رحم دِل خاتون تھیں۔ اُس نے یَن کو تسلّی دی اور کہا کہ تم جب تک یہاں ٹھہرنا چاہو ٹھہر سکتی ہو۔ پھر یَن نے ٹوکو کی ماں کے ساتھ مِل کر کھانے کی تیاری میں حصّہ لیا اور دوسرے کاموں میں بھی ہاتھ بٹایا۔ شام کو جب ٹوکو اور اُس کا والد گھر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ گُلدانوں میں تازہ پُھول لگے ہوئے تھے۔ گھر چمک رہا تھا اور کھانے کی میز پر کھانا لگا ہوا تھا۔ ٹوکو کی والدہ نے "یَن" کا تعارف کرایا تو ٹوکو اور اُس کے والد کو وہ چھوٹی سی لڑکی بے حد پسند آئی۔ ٹوکو کی والدہ نے ین سے کہا کہ ہماری کوئی بیٹی نہیں ہم تمہیں بالکل اپنی بیٹی کی طرح رکھیں گے اور تم ہمارے ساتھ ہی رہو گی۔

وقت گذرنے لگا اور جب دوبارہ خزاں آئی اور سردیوں کی ہوا چلی تو سارا علاقہ سُنسان ہو گیا اتنی برف باری ہوئی کہ ٹوکو کی پوری فصل تباہ ہو گئی ایک شام جب ٹوکو کے والد نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا "فصل ساری تباہ ہو چکی ہے اور اناج بھی بہت کم رہ گیا اب گذارہ کیسے ہو گا؟" یہ سُن کر ین نے کہا: بابا

جان! پریشان ہونے کی کیا بات ہے میں آپ لوگوں کی ہر طرح مدد کر سکتی ہوں کیونکہ مجھے زربفت بنانا آتا ہے جو کہ ایک نہایت قیمتی کپڑا ہے۔میں کمرے میں بیٹھ کر تین دِن میں بُن لوں گی اور ٹوکو اُسے بازار میں جاکر فروخت کر دے گا“ پھر ین نے ٹوکو کی امّی سے کہا ”امّی ! مجھے ہر رات صِرف ایک پیالہ چاول کی ضرورت ہو گی۔ پیالہ دروازے کے پاس رکھ دیا کریں اور ہاں اُس وقت تک میرے کمرے میں کوئی نہ آئے جب تک میں خود نہ بُلاؤں“

یہ کہہ کر ین کمرے میں چلی گئی۔ٹوکو ہر رات چاول کا پیالہ ین کے دروازے کے پاس رکھ دیتا ۔ ٹھیک تین دِن کے بعد ین جب کمرے سے باہر آئی تو اُس نے زربفت ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔یہ چمک دار ریشمی کپڑا یوں لگتا تھا جیسے برف چمک رہی ہو ۔ ین نے سفید ریشم اور چاندی سے یہ قیمتی کپڑا بنایا تھا۔

ین نے ٹوکو سے کہا ”تم یہ کپڑا بیچ کر اَناج خرید لو ۔ ٹوکو وہ کپڑا بازار میں لے گیا ۔ ایک امیر تاجر نے وہ کپڑا اچھے داموں خرید لیا اور یوں اُن کی کتنی ہی مشکلیں اُس کپڑے کے بیچنے سے ختم ہو گئیں ۔ سب بے حد خوش تھے وقت گذرتا رہا اور سردیوں کا درمیانی زمانہ آگیا ۔ زمین پر برف خوب گہری جَم گئی ۔ ین نے دوبارہ کپڑا بُننے کا ارادہ کیا ۔ اب کے وہ ایک نئے ڈیزائن کا کپڑا بُننے کا ارادہ رکھتی تھی ۔ وہ پھر تین دن کے لئےکمرے میں بند ہو گئی ۔ ہر رات چاول کا پیالہ اُس کے دروازے کے باہر رکھ دیا جاتا ۔ اِس مرتبہ ٹوکو کو بڑی جُستجو تھی کہ آخر ین کمرے میں بند ہو کر کیا کرتی ہے ؟ پہلی مرتبہ ٹوکو اور اُس کے والدین حیران ضرور ہوئے تھے لیکن خاموش رہے اور صبر سے بیٹھے رہے۔لیکن اِس مرتبہ ٹوکو سے ضبط نہ ہو سکا اور تیسرے دِن صُبح کو وہ بےاختیار کمرے میں داخل ہو گیا ۔

جوں ہی وہ کمرے کے اندر داخل ہوا اور اُس نے ین کو مخاطب کرنا چاہا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں ین کے بجائے ایک خوبصورت پرندہ زمین پر بیٹھا ہوا ہے جس کے جسم پر سفید ریشم کی ڈوریاں لٹک رہی ہیں اور قریب ہی سفید نَرم نَرم پروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ۔ پرندے نے چونچ اُٹھا کر ٹوکو کی جانب دیکھا اور اُسی خوبصورت لڑکی ”ین“ کی آواز میں بولی !

”حیران مت ہونا ٹوکو! میں وہی پرندہ ہوں جس کی تم نے اُس دِن شدید سردی کے موسم میں مدد کی تھی ۔ میں نے تمہارا شُکریہ ادا کرنے کے لیے یہ روپ دھارا تھا ۔ میں جانتی ہوں کہ تم سب لوگ مجھ سے بے حد محبّت کرتے ہو ۔ لیکن تم اگر اپنا وعدہ نہ توڑتے اور تین دِن پورے ہونے سے پہلے دروازہ نہ کھولتے تو میں ہمیشہ تمہارے پاس رہتی لیکن اب میں یہاں نہیں رہ سکتی ۔“

”او! میرے پیارے پرندے مُجھے معاف کر دو ۔ اور اپنی اسی شکل میں دوبارہ ہمارے ساتھ رہو“ ٹوکو نے نہایت رحم دِلی کے انداز میں کہا ، لیکن پرندے نے انکار کر دیا ”نہیں ٹوکو میں مجبور ہوں اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی“

یہ کہہ کر اُس نے ٹوکو اور اس کے والدین کو خُدا حافظ کہا جو اِس دوران کمرے میں آ گئے تھے ۔ وہ بڑی حیرت سے اُس خوبصورت پرندے کو دیکھ رہے تھے ۔ اُس کے بعد پرندہ آہستہ آہستہ اُڑتا ہوا سفید بادلوں میں گُم ہوگیا۔

بے چارہ ٹوکو بہت اُداس تھا ۔ لیکن اُسے اپنی بے صبری اور وعدہ خلافی کی سزا مِل چکی تھی ۔ وہ ایک اچھی دوست سے جُدا ہو گیا تھا ۔ بہرحال پرندے نے دوبارہ جو کپڑا تیار کیا تھا اُسے بیچ کر اُنہیں اتنے پیسے مِل گئے جو اُن کی ساری عمر کے لئے کافی تھے ۔ اب ٹوکو کو شدید سردی میں جنگل سے لکڑیاں لانے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی ۔ لیکن وہ اُس پرندے کو کبھی نہ بھول سکا ۔

ایک وصیّت

محمد اقبال ثاقب

عزّت بیگ شہر کا ایک مالدار شخص تھا ۔ اُسے شکار کھیلنے کا بُہت شوق تھا ۔ ایک شام اُس نے اپنے دونوں ملازموں کو بُلایا ۔ اُن میں سے ایک کا نام کریم اور دوسرے کا نام سُلطان تھا ۔ عزّت بیگ نے اُن سے کہا کہ کل ہم جنگل میں شکار کھیلنے جا رہے ہیں اس لیے تمام سامان تیار کر لو ۔ ملازموں نے حُکم بجا لاتے ہوئے تمام سامان تیار کر دیا ۔ اَگلی صبح عزّت بیگ ملازموں کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا ۔ جنگل میں پہنچ کر اُنہوں نے گھوڑوں کو ایک گھنے درخت کے نیچے باندھ دیا اور شکار کھیلنے میں مشغول ہو گئے ۔

جنگل میں اچانک عزّت بیگ کو ایک جنگلی خرگوش نظر آیا ۔ اُس نے ملازموں کو وہیں رُکنے کو کہا اور خود خرگوش کا تعاقب کرنے لگا ۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ملازموں کو عزّت بیگ کی چیخ سُنائی دی ۔ وہ دوڑ کر اُس کی طرف گئے ۔ عزّت بیگ گھاس پر لیٹا ہوا تھا ۔ کریم جلدی سے اُس کے قریب گیا اور بولا "مالک ! مالک! کیا ہوا؟" لیکن عزّت بیگ نے کوئی جواب نہ دیا ۔ وہ بالکل بے ہوش تھا ۔ اچانک کریم کی نظر عزّت بیگ کی ٹانگ پر پڑی ۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کی پِنڈلی پر ایک چھالا سا بنا ہوا ہے ۔ کریم سمجھ گیا کہ اس کو سانپ نے کاٹ لیا ہے ۔

کریم نے پریشانی کے عالم میں سُلطان کو بتایا کہ وہ ایک جوگی کو جانتا ہے جو اِس جنگل کے قریب ایک بستی میں رہتا ہے ۔ کریم نے سلطان سے کہا "تم مالک کے پاس ٹھہرو۔میں بستی سے جوگی کو بُلا کر لاتا ہوں" ۔ یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بستی کی طرف روانہ ہو گیا ۔

کریم کے جانے کے بعد سلطان کی نظر عزّت بیگ کی قمیص کے نیچے چُھپے ہوئے ہار پر پڑی ۔ یہ سونے کا ایک قیمتی ہار تھا ۔ سُلطان نے سوچا کہ عزّت بیگ اِس وقت بے ہوش ہے اور اس کے بچنے کی بھی کوئی اُمید نہیں ۔ ہم دونوں اِس وقت اکیلے ہیں اور ہمیں کوئی دیکھ بھی نہیں رہا ۔ اگر میں یہ ہار چُرا لوں تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی ۔ سُلطان نے یہ سوچ کر عزّت بیگ کے گلے سے ہار اُتار لیا اور اُس کو اپنے سامان میں چُھپا دیا ۔

اُدھر کریم جب بستی میں پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ جوگی بستر پر لیٹا ہوا ہے اور اُسے شدید بُخار ہے ۔ کریم نے جوگی کو بتایا کہ جنگل میں ہمارے مالک کو سانپ نے کاٹ لیا ہے اور وہ بے ہوش ہے ۔ آپ جلدی سے کچھ کریں تاکہ اس کی جان بچ جائے ۔ جوگی نے کریم کی یہ بات سُن کر کراہتے ہوئے جواب دیا "بیٹا اگر تمہارا مالک بے ہوش ہو گیا ہے تو یقیناً اُس کو "سنگچور" سانپ نے ڈسا ہے ۔ اور "سنگچور" کے ڈسے ہوئے کو کوئی بھی بچا نہیں سکتا ۔ البتہ میں تمہیں ایک دوائی دیتا ہوں ۔ اگر تمہارے واپس جانے تک تمہارا مالک زندہ ہوا تو یہ دوائی اُس جگہ پر لگا دینا جہاں سانپ نے ڈسا ہے ۔ اس دوائی

سے تمہارے مالک کی جان تو نہیں بچ سکتی البتہ تھوڑی دیر کے لیے وہ ہوش میں ضرور آ جائے گا"۔

کریم نے جوگی سے وہ دوائی لی اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے واپس جنگل میں پہنچ گیا۔ سلطان عزّت بیگ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ عزّت بیگ ابھی تک بے ہوش تھا۔ جُوں جُوں زہر پھیل رہا تھا اُس کا چہرہ نیلا ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن سینے کا کپڑا اوپر نیچے حرکت کر رہا تھا۔ کریم نے سانس کی آمد و رفت کا سِلسلہ جاری دیکھ کر جلدی سے دوا نکالی اور اُس کو چھالے پر لگا دیا۔ دوائی لگانے سے کچھ دیر بعد عزّت بیگ ہوش میں آ گیا۔ اُس نے کریم کو پُکارا اور کہا:

"کریم اب میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر آج کوئی میرا بیٹا ہوتا تو میرا کاروبار سنبھال لیتا۔ اب تُم میرے بیٹے ہو۔ تم میرا کاروبار اور جائیداد سنبھال لینا"۔

عزّت بیگ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر اچانک چُپ ہو گیا۔ کریم نے اُونچی آواز سے "مالک" "مالک" پکارا۔ لیکن اب آواز کے ساتھ اُس کی سانس بھی بند ہو چکی تھی۔

عزّت بیگ نے اپنا سب کچھ کریم کو دے دیا تھا۔ سلطان یہ سُن کر جل بُھن کر راکھ ہو گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں ایک چال سوچی اور عزّت بیگ کی جائداد حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ اُس نے کریم سے آنکھ بچا کر سونے کا وہ ہار اپنے سامان سے نکال کر کریم کے سامان میں چُھپا دیا اور کہنے لگا "کریم، تم یہاں ٹھہرو۔ میں سواری لے کر آتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

شہر پہنچ کر سلطان نے عزّت بیگ کے رشتے داروں اور دوستوں کو اُس کی موت کی خبر دی اور ساتھ یہ بھی مشہور کر دیا کہ مالک نے مجھے اپنا وارث مقرر کیا ہے۔ یہ بات مشہور کرنے کے بعد سُلطان نے سواری لی اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگل سے کریم اور سُلطان نے عزّت بیگ کی لاش کو بگھی میں ڈالا اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو کریم کو پتہ چل گیا کہ سُلطان نے کیا جھوٹی بات مشہور کر رکھی ہے۔ اُس نے سوچا کہ مالک کو دفن کرنے کے بعد لوگوں کو اصل حقیقت بتا دوں گا۔

عزّت بیگ کی بیوی نے جب اپنے شوہر کی لاش دیکھی تو اُسے سونے کا ہار نظر نہ آیا۔ اُس نے شور مچا دیا۔ سبھی نے دونوں ملازموں پر شک کیا۔ جب کریم اور سلطان کے سامان کی تلاشی لی گئی تو ہار کریم کے سامان سے برآمد ہو گیا۔ کریم ہار چُرانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ رو رو کر کہہ رہا تھا کہ میں نے ہار نہیں چُرایا۔ سلطان ایک طرف کھڑا ہو کر یہ سب کچھ فاتحانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ کریم کی لوگوں نے ایک نہ سُنی اور اُسے قید کروا دیا۔ کریم نے قاضی کے سامنے بھی رو رو کر کہا کہ حضور! میں بے گناہ ہوں، مُجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔ کریم نے مالک کی وصیّت کے بارے میں بھی بتا دیا کہ اُس نے مجھے اپنا وارث
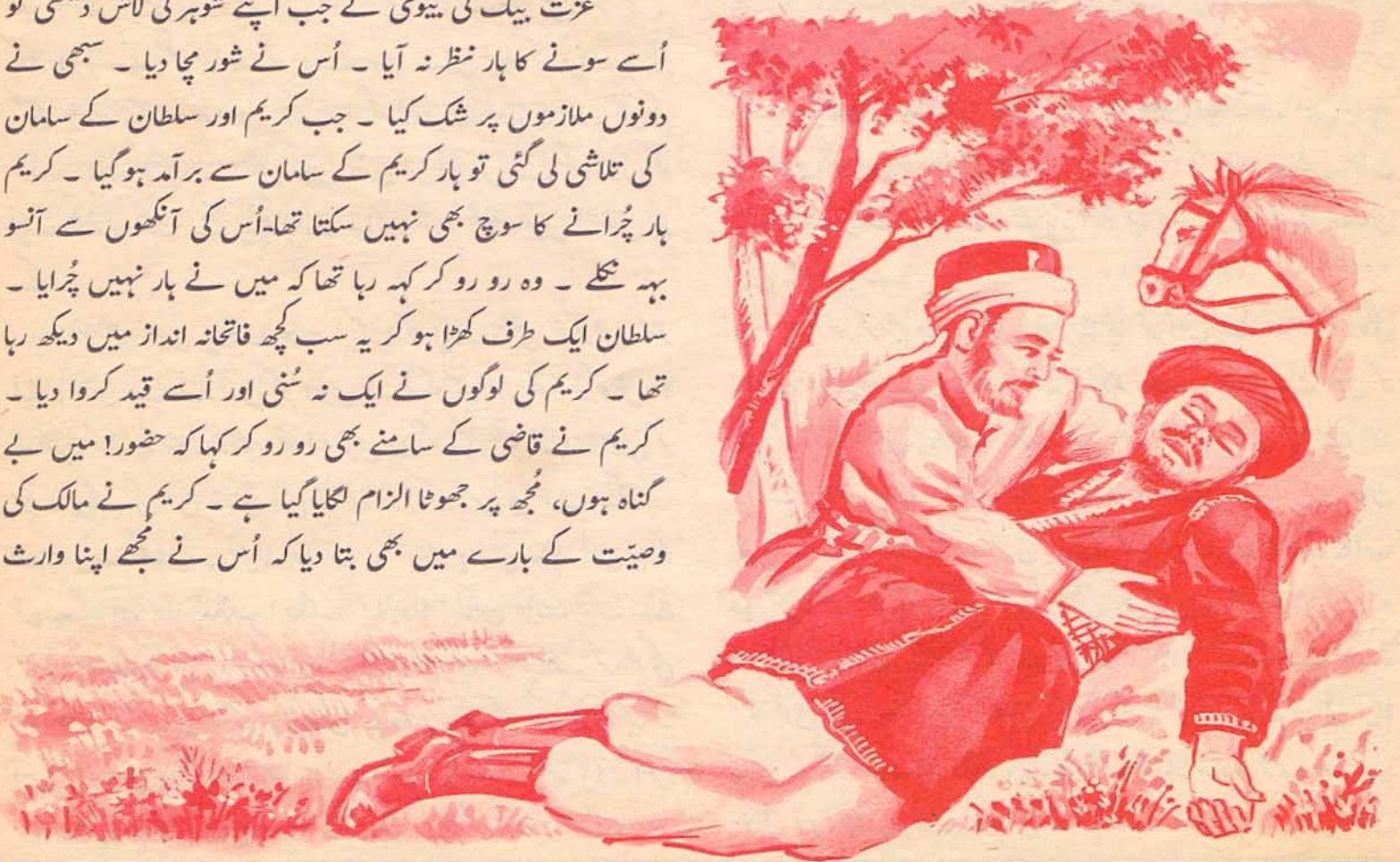
مقرر کیا تھا۔سُلطان نے جھوٹی بات مشہور کی ہے ۔ قاضی نے کریم سے کہا کہ عزّت بیگ کے کفن دفن کے بعد تمہیں صفائی کا پورا موقع دیا جائے گا ۔

کچھ دِنوں بعد قاضی نے عزّت بیگ کی بیوی اور سُلطان کو عدالت میں طلب کیا اور کریم کو بھی قید خانے سے بُلوا لیا ۔ کریم کی رو رو کر آنکھیں سوج گئیں تھیں ۔ اس وقت بھی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ۔ قاضی صاحب نے عزت بیگ کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا کریم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ بولی "کریم ہمارا سب سے پُرانا اور دیانتدار ملازم ہے ۔ میرا شوہر اس کو بہت پسند کرتا تھا"۔ یہ سُن کر قاضی نے سلطان اور کریم کو حکم دیا کہ تم دونوں لال باغ سے اپنے مالک کی قبر کے لیے چنبیلی کا ایک ایک پودا لاؤ ۔ یہ سُن کر کریم اور سلطان لال باغ کی روانہ ہو گئے جو وہاں سے کافی دُور تھا ۔ عزّت بیگ کی بیوی واپس گھر چلی گئی اور سب لوگ کریم اور سلطان کی واپسی کا انتظار کرنے لگے ۔

کریم تین دِن بعد چنبیلی کا پودا لے کر عدالت میں پہنچ گیا ۔ اُس باغ میں چنبیلی کا ایک ہی پودا تھا ۔ کریم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلطان اُس سے پہلے پودا لے کر عدالت میں موجود تھا ۔ عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ۔ سبھی کو قاضی صاحب کے فیصلے کا انتظار تھا ۔ قاضی نے حُکم دیا کہ اپنے اپنے پودے دکھاؤ ۔ دونوں نے اپنے اپنے پودے دِکھائے ۔ قاضی نے پودے دیکھنے کے بعد سُلطان سے پوچھا کہ تم اپنا پودا کہاں سے لائے ہو؟ اُس نے جواب دیا "جناب، لال باغ سے"۔ سُلطان کا یہ جواب سُن کر قاضی نے لوگوں سے کہا کہ "اب میں یہ بتا سکتا ہوں کہ عزّت بیگ نے کِس کو اپنا وارث مقرّر کیا تھا اور ہار کس نے چُرایا تھا"۔ یہ سُن کر لوگوں نے حیران ہو کر قاضی سے پوچھا کہ جناب، آپ نے یہ سب کچھ کیسے معلوم کیا؟ قاضی نے جواب دیا "میں جانتا تھا کہ لال باغ میں چنبیلی کا صرف ایک ہی پودا ہے اور کریم جو پودا لے کر آیا ہے یہ وہی پودا ہے۔ کریم چونکہ فرض شناس اور مخلص آدمی ہے اس لیے عزّت بیگ نے اِسی کو اپنا وارث مقرر کیا ہو گا۔ سلطان جھوٹا اور چالباز آدمی ہے ۔ اس نے لال باغ جانے کی بجائے کسی اور جگہ سے چنبیلی کا پودا لا کر مجھے دِکھا دیا اور جھوٹ بولا کہ میں یہ پودا لال باغ سے لایا ہوں ۔ ایسا جھوٹا اور دھوکے باز شخص ہی اپنے مالک کا ہار چُرا سکتا ہے۔یقیناً یہ ہار سلطان ہی نے چُرا کر کریم کے سامان میں رکھ دیا تھا تاکہ لوگ کریم کو چور سمجھ کر اُس کی کسی بات کا یقین نہ کریں اور سُلطان کو ہی عزّت بیگ کا وارث مان لیں ۔

قاضی نے سُلطان کو قید کرنے کا حُکم دیا اور کریم کو عزّت بیگ کی جائیداد کا نگران مقرر کر دیا ۔

سب اندھے

ایک دن اکبر بادشاہ نے راجہ بیربل سے پوچھا ۔ راجہ ! ہمارے مُلک میں کتنے اندھے ہیں ؟ بیربل نے جواب دیا مہاراج سب ہی اندھے ہیں ۔

اکبر نے کہا! راجہ جی! کیسی بات کرتے ہو ؟

بیربل نے کہا مہاراج ! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ؟ حضور خود دیکھ لیں ۔ آپ جھروکے میں بیٹھ جائیں ۔ میں سڑک پر چارپائی بُننے لگتا ہوں ۔ جو یہ پوچھے ۔ راجہ جی کیا کر رہے ہو ؟ اس کا نام اندھوں میں لکھ لیں ۔

چناچہ راجہ جی سڑک پر چارپائی بُننے لگے ۔ ہر آدمی یہی پوچھتا ۔ راجہ جی ! آپ کیا کر رہے ہیں ؟ بیربل آواز دیتا ۔ مہاراج ! اس کا نام بھی لکھ لیں۔ شام تک جتنے بھی اُدھر سے گزرے ۔ سب نے ایک ہی سوال کیا ۔ راجہ جی کیا کر رہے ہو؟

بلا عُنوان

اِس کارٹون کا عُنوان لکھیے اور 1000 روپے کے انعامات حاصل کیجیے۔ آخری تاریخ 10 مئی ہے۔

اپریل 1989 کے کارٹون کے بے شُمار عنوان موصُول ہوئے، جن میں سے ججوں کو صرف ایک عُنوان "اپنی مدد آپ" پسند آیا۔ جن بچّوں نے یہ عُنوان تجویز کیا، اُن کے نام یہ ہیں :

ہما قیوّم بڈھ پیر پشاور — شازیہ جمیل کراچی ساؤتھ — ذیشان نائم واہ کینٹ — نعیم ارشد انجم رحیم یارخان — رضوان جمیل کراچی — احسن کامران کا چھوپورہ لاہور — محمّد سعید بڈھ پیر پشاور — تحسین ناصر (مکمل پتا نہیں لکھا) ۔ فیصل قدیر کچہری بازار خانیوال — باسط الطاف میانوالی — حمیر افیض ٹیکسلا — سحر رضا ملتان روڈ لاہور — محمد آصف ضیاء حویلیاں چھاؤنی — شہزاد حُسین چکوال — مُحب الحسین خانیوال — مصحف رسُول گلشنِ عائشہ کراچی —

اِن بچّوں کو 50,50 رُوپے کی کتابیں دی گئی ہیں ۔

آپ بھی لکھیے

اسکول میں میرا پہلا دن

نوید جمیل، رنچھوڑ لائن، کراچی

البم کا صفحہ پلٹتے ہوئے میری نظر اپنی ایک تصویر پر رُک گئی ۔ یہ تصویر مجھے بہت پسند ہے کیوں کہ یہ اس دن اُتاری گئی تھی جب میں پہلی دفعہ اسکول گیا تھا ۔ سفید رنگ کی قمیص اور گرے رنگ کی نیکر میں میرا مُسکراتا ہوا چہرہ مجھے اس دن کے خوش گوار تجربے کی یاد دلاتا ہے ۔ تصویر دیکھتے ہوئے میں ماضی کے دُھندلکوں میں گُم ہوگیا ۔

اس وقت میری عمر پانچ سال تھی ۔ میں جب باجی اور بھیّا کو اسکول جاتے دیکھتا تو دل چاہتا کہ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں ۔ آخر ایک دن امّی اور ابّو نے مجھے اسکول میں داخل کرانے کا فیصلہ کر لیا ۔ جب امّی نے مجھے بتایا کہ کل مجھے اسکول جانا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ امّی میرا یونیفارم اور کتابیں لے آئی تھیں ۔ رات بھر اسکول جانے کا خیال مجھے خوش کرتا رہا ۔

صُبح میں جلدی سے اُٹھ گیا ۔ مُنہ ہاتھ دھوکر ناشتا کیا ۔ امّی نے مجھے یونیفارم پہنایا اور بستہ اور لنچ بکس دے کر خُوب پیار کیا ۔ پھر میں ابّو کے ساتھ ہنسی خوشی اسکول کی جانب روانہ ہوگیا ۔ اسکول گھر کے قریب ہی تھا ۔ میرے جیسے اور بھی بچّے ہنستے مُسکراتے اور بعض صُبح جلدی اُٹھنے پر منہ بسورتے ہوئے اپنے امّی اور ابّو کے ساتھ آ رہے تھے ۔ ابّو مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں لے گئے ۔ انہوں نے رجسٹر میں میرا نام درج کیا اور پھر مجھے گراؤنڈ میں بھیج دیا ۔ گراؤنڈ میں بہت سے بچّے جمع تھے ۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور سب بچّے لائنیں بنا کر کھڑے ہوگئے ۔ میں بھی ایک لائن میں کھڑا ہوگیا ۔ میں نے سب کے ساتھ ترانہ پڑھا اور پھر ہم لوگ کلاس روم میں آ گئے ۔ کلاس روم میں ڈیسک رکھّے ہوئے تھے سب بچّے وہاں بیٹھ گئے میرے ساتھ جو لڑکا بیٹھا تھا، اس کا نام نوید تھا ۔ پہلے تو ہم دونوں چُپ چُپ رہے ۔ شاید وہ بھی میری طرح کچھ کچھ ڈر رہا تھا ۔ مگر پھر ہم دونوں دوست بن گئے ۔ آپس میں باتیں کرنے لگے ۔ اتنے میں ہماری مِس آگئیں ۔ انہوں نے ہر بچّے کو پیار کیا اور اس کا نام پوچھا ۔ مجھے یہ مِس بہت پسند آئیں ۔ بالکل باجی کی طرح پیاری اور مسکرانے والی ۔ اس روز مِس نے ہمیں اُردو کی نظم پڑھائی ۔ پھر آدھے وقفے میں ہم کھیلنے چلے گئے ۔ یوں سب ہم جماعتوں سے میری دوستی ہوگئی ۔

مگر جوں ہی بارہ بجے چُھٹی کا وقت قریب آیا، مجھے امّی یاد آنے لگیں ۔ شاید اس لئے کہ میں کبھی امّی سے اتنی دیر علیحدہ نہیں رہا تھا ۔ جیسے ہی چُھٹّی کی گھنٹی بجی، مِس نے ہمیں خُدا حافظ کہا اور سب بچّے گیٹ کی طرف دوڑے ۔ جلد ہی مجھے امّی نظر آگئیں جو مجھے ہی تلاش کر رہی تھیں ۔ میں ان سے لپٹ گیا ۔ انہوں نے مجھے پیار کیا اور پوچھا کہ ڈر تو نہیں لگا؟ میں نے نفی میں سر ہلا دیا اور انہیں تمام دن کی روئداد سنانے لگا ۔

”ارے عدیل بیٹا ! یہ خود بخود کیوں مسکرا رہے ہو؟ امّی کی آواز مجھے خیالوں کی اس خوبصورت دُنیا سے واپس کھینچ لائی اور میں البم بند کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ شاید میں اپنی زندگی کا وہ خوبصورت دن کبھی نہ بھلا سکوں ۔ (پہلا انعام : 50 روپے کی کتابیں)

2

طاہر محمود، ٹاؤن شپ، لاہور

اسکول تو آپ بھی جاتے ہوں گے اور اسکول میں پہلا دن آپ نے بھی گزارا ہوگا ۔ مگر میرا پہلا دن بہت عجیب اور مزے دار تھا ۔ جس دن میں اسکول میں داخل ہونے گیا وہ اتوار کا دِن تھا ۔ ہمارے ابّو کو دفتر سے اتوار کے دن چھٹی ہوتی ہے ۔ امّی ابّو مجھے سکول داخل کروا کر واپس آگئے ۔ اسکول کے پرنسپل نے مجھے میری کلاس کا کمرا دکھایا اور میں کلاس میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا ۔ بستہ کھولا ہی تھا کہ اچانک مجھے کسی نے دھکّا دیا اور ساتھ ہی کہا ”شرم نہیں آتی دوسروں کی کُرسی پر بیٹھتے ہوئے؟“ سب لڑکے میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے ۔ میں ایک دوسری کرسی پر جا بیٹھا ۔

اس کے بعد کلاس ٹیچر نے حاضری لگائی ۔ مگر میرا نام نہ بولا ۔ لڑکوں نے کہا ”سر یہ لڑکا نیا آیا ہے ۔ اس کا نام رجسٹر میں درج کر لیں ۔“ ماسٹر صاحب نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے ۔ میں نے کہا ”جی، طاہر محمود ۔“ پھر سر نے پوچھا ”رول نمبر کیا ہے ؟“ میں حیران پریشان کہ رول نمبر تو مجھے

آپ بھی لکھیے

اسکول میں میرا پہلا دن

نوید جمیل، رنچھوڑ لائن، کراچی

البم کا صفحہ پلٹتے ہوئے میری نظر اپنی ایک تصویر پر رک گئی ۔ یہ تصویر مجھے بہت پسند ہے کیوں کہ یہ اس دن اُتاری گئی تھی جب میں پہلی دفعہ اسکول گیا تھا ۔ سفید رنگ کی قمیص اور گرے رنگ کی نیکر میں میرا مُسکراتا ہوا چہرہ مجھے اس دن کے خوش گوار تجربے کی یاد دلاتا ہے ۔ تصویر دیکھتے ہوئے میں ماضی کے دُھندلکوں میں گم ہوگیا ۔

اس وقت میری عمر پانچ سال تھی ۔ میں جب باجی اور بھیّا کو اسکول جاتے دیکھتا تو دل چاہتا کہ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں ۔ آخر ایک دن امّی اور ابّو نے مجھے اسکول میں داخل کرانے کا فیصلہ کر لیا ۔ جب امّی نے مجھے بتایا کہ کل مجھے اسکول جانا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ امّی میرا یونیفارم اور کتابیں لے آئی تھیں ۔ رات بھر اسکول جانے کا خیال مجھے خوش کرتا رہا ۔

صُبح میں جلدی سے اُٹھ گیا ۔ مُنہ ہاتھ دھوکر ناشتا کیا ۔ امّی نے مجھے یونیفارم پہنایا اور بستہ اور لنچ بکس دے کر خُوب پیار کیا ۔ پھر میں ابّو کے ساتھ ہنسی خوشی اسکول کی جانب روانہ ہوگیا ۔ اسکول گھر کے قریب ہی تھا ۔ میرے جیسے اور بھی بچّے ہنستے مُسکراتے اور بعض صُبح جلدی اُٹھنے پر منہ بسورتے ہوئے اپنے امّی اور ابّو کے ساتھ آ رہے تھے ۔ ابّو مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں لے گئے ۔ انہوں نے رجسٹر میں میرا نام درج کیا اور پھر مجھے گراؤنڈ میں بھیج دیا ۔ گراؤنڈ میں بہت سے بچّے جمع تھے ۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور سب بچّے لائنیں بنا کر کھڑے ہوگئے ۔ میں بھی ایک لائن میں کھڑا ہوگیا ۔ میں نے سب کے ساتھ ترانہ پڑھا اور پھر ہم لوگ کلاس روم میں آ گئے ۔ کلاس روم میں ڈسک رکھّے ہوئے تھے سب بچّے وہاں بیٹھ گئے میرے ساتھ جو لڑکا بیٹھا تھا ، اس کا نام نوید تھا ۔ پہلے تو ہم دونوں چُپ چُپ رہے ۔ شاید وہ بھی میری طرح کچھ کچھ ڈر رہا تھا ۔ مگر پھر ہم دونوں دوست بن گئے ۔ آپس میں باتیں کرنے لگے ۔ اتنے میں ہماری مِس آگئیں ۔ انہوں نے ہر بچّے کو پیار کیا اور اس کا نام پوچھا ۔ مجھے یہ مِس بہت پسند آئیں ۔ بالکل باجی کی طرح پیاری اور مسکرانے والی ۔ اس روز مس نے ہمیں اُردو کی نظم پڑھائی ۔ پھر آدھے وقفے میں ہم کھیلنے چلے گئے ۔ یوں سب ہم جماعتوں سے میری دوستی ہوگئی ۔

مگر جوں ہی بارہ بجے چُھٹی کا وقت قریب آیا ، مجھے امّی یاد آنے لگیں ۔ شاید اس لئے کہ میں کبھی امّی سے اتنی دیر علیحدہ نہیں رہا تھا ۔ جیسے ہی چُھٹی کی گھنٹی بجی ، مِس نے ہمیں خُدا حافظ کہا اور سب بچّے گیٹ کی طرف دوڑے ۔ جلد ہی مجھے امّی نظر آگئیں جو مُجھے ہی تلاش کر رہی تھیں ۔ میں ان سے لپٹ گیا ۔ انہوں نے مجھے پیار کیا اور پوچھا کہ ڈر تو نہیں لگا؟ میں نے نفی میں سر ہلا دیا اور انہیں تمام دن کی روئداد سنانے لگا ۔

"ارے عدیل بیٹا ! یہ خود بخود کیوں مسکرا رہے ہو؟ امّی کی آواز مجھے خیالوں کی اس خوبصورت دُنیا سے واپس کھینچ لائی اور میں البم بند کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ شاید میں اپنی زندگی کا وہ خوبصورت دن کبھی نہ بھلا سکوں ۔ (پہلا انعام : 50 روپے کی کتابیں)

2

طاہر محمود، ٹاؤن شپ، لاہور

اسکول تو آپ بھی جاتے ہوں گے اور اسکول میں پہلا دن آپ نے بھی گزارا ہوگا ۔ مگر میرا پہلا دن بہت عجیب اور مزے دار تھا ۔ جس دن میں اسکول میں داخل ہونے گیا وہ اتوار کا دِن تھا ۔ ہمارے ابّو کو دفتر سے اتوار کے دن چھٹی ہوتی ہے ۔ امّی ابّو مجھے سکول داخل کروا کر واپس آگئے ۔ اسکول کے پرنسپل نے مجھے میری کلاس کا کمرا دکھایا اور میں کلاس میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا ۔ بستہ کھولا ہی تھا کہ اچانک مجھے کسی نے دھکّا دیا اور ساتھ ہی کہا "شرم نہیں آتی دوسروں کی کُرسی پر بیٹھتے ہوئے؟" سب لڑکے میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگے ۔ میں ایک دوسری کرسی پر جا بیٹھا ۔

اس کے بعد کلاس ٹیچر نے حاضری لگائی ۔ مگر میرا نام نہ بولا ۔ لڑکوں نے کہا "سر یہ لڑکا نیا آیا ہے ۔ اس کا نام رجسٹر میں درج کر لیں ۔" ماسٹر صاحب نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے ۔ میں نے کہا "جی ، طاہر محمود ۔" پھر سر نے پوچھا "رول نمبر کیا ہے ؟" میں حیران پریشان کہ رول نمبر تو مجھے

تو تمہیں اسکول بھیج دوں گی ۔ تب میں یہ سمجھتا تھا کہ اسکول کوئی بہت ہی خوف ناک جگہ ہے ، جہاں شریر بچّوں کی پٹائی ہوتی ہے ۔

ایک دن ابّو گھر آئے اور امّی سے کہنے لگے "کل صبح حسن کو تیار کر دیں ۔ میں اسے اسکول لے جاؤں گا۔" یہ سن کر میں غصّے سے چیخا! میں اسکول نہیں جاؤں گا ۔ مگر امی نے کہا تمہیں کل سکول ضرور جانا پڑے گا ۔ " یہ سن کر میں رونے لگا ۔

اگلے دن صبح کو میں بستر سے ہی نہیں نکلا ۔ ابّو نے چپکے سے میرا بستہ گاڑی میں رکھوا دیا ۔ پھر آکر کہنے لگے "چلو، آج تمہیں اسکول نہیں لے کر جاتے ۔ مگر تم اچھے اچھے کپڑے پہن لو تاکہ ہم تمہیں پارک کی سیر کرا دیں" ۔ پہلے تو مجھے کچھ شک ہوا مگر پھر میں نے کپڑے پہن لیے ۔ ابّو مجھے لے کر پارک کی طرف چل پڑے جب پارک شروع ہوا تو میں نے ابّو سے کہا کہ پارک کے اندر چلیں ۔ ابّو نے کہا پارک کا گیٹ آگے چل کر آئے گا ۔" تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پارک کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے ہیں ۔ میں سمجھ گیا کہ ابّو مجھے اسکول لے آئے ہیں ۔ میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا ۔

ابّو نے مجھے پیار کیا ، تسلی دی اور پھر مجھے لے کر ایک کمرے میں داخل ہوگئے ۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا ۔ ابّو نے اس آدمی سے کچھ باتیں کیں ۔ اس نے مجھے پیار کیا اور ایک ٹافی بھی دی ۔ پھر ایک آیا آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے گئی ۔ اب میرا خوف کافی حد تک دور ہوچکا تھا ۔ میں نے دیکھا کہ کمرے میں چاروں طرف تصویریں لگی ہوئی ہیں اور ایک مِس بہت سے بچّوں کو پڑھا رہی ہیں ۔ انہوں نے بھی مجھے پیار کیا ۔ میں اپنا بستہ لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا ۔

جب چُھٹّی ہوئی تو ابّو مجھے لینے کلاس ہی میں آگئے اور مجھ سے پوچھا "کیسا رہا تمہارا سکول میں پہلا دن؟" میں نے خوش ہو کر کہا "بہت اچھا۔" (چوتھا انعام 35 روپے کی کتابیں)

5

محمد پرویز نورؔ، ملتان روڈ، لاہور

امّی نے مجھے آواز دی اور میں جلدی سے ناشتے کی میز پر پہنچ گیا ۔ ناشتے کے بعد امّی نے مجھے اسکول کا یونیفارم پہنایا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر اسکول کی طرف روانہ ہوگئیں ۔ یہ اسکول مین روڈ پر تھا ۔ ہم اسکول میں داخل ہوئے تو ارد گرد کے کمروں سے بچّوں کے شور کی آوازیں آرہی تھیں ۔ امّی مجھے ایک کمرے میں لے گئیں ۔ یہ میری کلاس تھی اور اس کی حالت بڑی عجیب تھی ۔ زمین پر کوڑا کرکٹ اور کاغذوں کے ڈھیر لگے تھے ۔ بنچ بھی گندے اور ٹوٹے پھوٹے تھے ۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی دنوں سے صفائی نہیں ہوئی ۔

امّی نے مجھے سب سے اگلے بینچ پر ایک لڑکے کے ساتھ بٹھا دیا ۔ وہ لڑکا ہر ایک کو تنگ کر رہا تھا ۔ کسی کو تھپڑ مار دیتا تو کسی کی کاپی پھاڑ دیتا ۔ میں دوسری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا ۔ امّی تھوڑی دیر میرے پاس کھڑی مِس کا انتظار کرتی رہیں ۔ مگر جب وہ نہ آئیں تو مجھے ایک روپیہ دے کر چلی گئیں ۔

میرے ساتھ بیٹھا ہوا لڑکا اچانک میری طرف بڑھا ۔ میں نظریں نیچی کئے خاموشی سے بیٹھا رہا ۔ وہ میرے قریب آیا اور بڑی رُعب دار آواز میں میرا نام پوچھا ۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا، تو اس نے ایک تھپڑ میرے منہ پر مار دیا ۔ میں خاموش رہا ۔ مگر جب اس نے میرے ایک لات رسید کی تو میں طیش میں آگیا اور میں نے بھی جواب میں اس کے دو تھپڑ رسید کر دیئے ۔ پھر کیا تھا اس نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا ۔ لگا گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے ۔ اتنے میں مِس آگئیں ۔ انہوں نے مجھ سے سخت لہجے میں کہا ! تم نے اسے کیوں مارا ؟۔ میں نے کہا اس نے مجھے پہلے ۔۔۔۔" ابھی الفاظ میرے منہ ہی میں تھے کہ مِس کے تین زناٹے دار تھپڑ میرے گال پر پڑے اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا ۔ اس کے بعد مِس نے مجھے جماعت سے باہر نکال دیا ۔

تقریباً کوئی آدھ گھنٹے تک میں ہچکیاں لے لے کر روتا رہا ۔ پھر مِس نے مجھے کلاس میں بُلوایا اور سب سے آخر میں ایک گرد آلود بینچ پر بٹھا دیا ۔ ایک لڑکا اٹھ کر میرے پاس آیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا ۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ تمہیں اس لڑکے کو نہیں مارنا چاہئے تھا ۔ وہ مِس کا لڑکا ہے ۔ چھٹّی کے وقت امّی مجھے لینے آئیں تو میں نے انہیں یہ واقعہ بتایا اور

کہا کہ میں اس اسکول میں نہیں پڑھوں گا ۔ چند روز بعد انہوں نے مجھے دوسرے اسکول میں داخل کرا دیا ۔ یہ اسکول اس اسکول سے بہت اچھا اور اس کے ٹیچر بھی بہت شفیق اور ہمدرد تھے ۔ (پانچواں انعام 30 روپے کی کتابیں)

6 امبر گل، سلیم پارک، سرگودھا

مجھے بچپن ہی سے پڑھنے کا بہت شوق تھا ۔ روز امّی سے پوچھتی کہ کب میں اسکول جاؤں گی ۔ آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ دن آپہنچا جس کا مجھے شِدّت سے انتظار تھا ۔ یعنی اسکول جانے کا دن آپہنچا ۔ میں آپ کو اسی پہلے دن کی سرگزشت سُناتی ہوں ۔

جب میں اسکول میں پہنچی تو بڑی لڑکیوں اور لڑکوں کو دیکھ کر بہت گھبرائی ۔ میری کوئی سہیلی نہ تھی ۔ اس لئے میں اپنے آپ کو اکیلی محسوس کر رہی تھی ۔ جب میں اسمبلی میں گئی تو کسی نے شرارت سے میری کمر پر ایک کاغذ چپکا دیا جس پر لکھا تھا ۔ "گدھی برائے فروخت" ۔ میں جہاں جہاں سے گزرتی قہقہوں سے بھرپور آوازیں آتیں ۔ مثلاً کتنے کی ہے ؟ تمہارا مالک کہاں ہے ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ اسی حالت میں مَیں کلاس میں پہنچی تو مِس کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا ۔ جب ان کی ہنسی رکی تو انہوں نے مجھے پاس بلایا اور کمر سے وہ کاغذ اتارا ۔ جب کہیں جا کر میری جان اس عذاب سے چھوٹی ۔

بریک میں مجھے باہر نکلنے کی ہمّت ہی نہ ہوئی ۔ لیکن کلاس میں بیٹھا بھی نہ گیا ۔ آخر اٹھ کر باہر نکل گئی ۔ کچھ باجیوں نے دیکھا کہ یہ آسانی سے شکار ہو سکتی ہے تو انہوں نے مجھے پیار سے اپنے پاس بلایا اور مجھے لے کر اپنی کلاس کی طرف بڑھیں اور کہا کہ ہم تمہارا میک اپ کریں گی ۔ پھر تو انہوں نے مجھے وہ جوکر بنایا کہ جب میں باہر نکلی تو ہر طرف سے ہنسی کے فوارے چھوٹتے دکھائی دیتے ۔ مجھے کچھ پتا نہ چلا ۔ اسی حالت میں چھٹی ہوگئی اور میں گھر کی طرف روانہ ہوگئی ۔ گھر آئی تو سب اتنا ہنسے کہ خدا کی پناہ ؛ ۔ بھیّا نے کہا ہم نے تو بہن اسکول بھیجی تھی ۔ یہ جوکر کہاں سے آگیا؟ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ۔ آخر کار باجی کو مجھ پر رحم آگیا ۔ انہوں نے میرا منہ دھویا اور کپڑے تبدیل کروائے ۔ (چھٹا انعام: 25 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار ادیبوں کی کہانیاں بھی اچھی تھیں ۔ انہیں ۱۵،۱۵ روپے کی کتابیں دی گئی ہیں ۔

محمد احمد بابر ، کراچی ۔ ایاز احمد ، کوہاٹ ۔ زینب نثار ، گارڈن ایسٹ کراچی ۔ عبدالعزیز ، ہاسٹل نمبر ۱۹ لاہور ۔ نعیم رمضان ، الدمام سعودی عرب ۔ مس معینہ چغتائی ، اسلام آباد ۔ زارا مرزا ، ماڈل ٹاؤن لاہور ۔ کامران حمید ، وحدت کالونی لاہور ۔ رضوان جمیل ، کراچی ساؤتھ ۔ چوہدری غضنفر علی ، ڈچکوٹ ۔ عاصم شاہ ، کوہاٹ ۔ محمد عزیز ، سرائے عالمگیر ۔ محمد وہاج ، لاہور ۔ زبیر حسین شاہ ، میانوالی ۔ شکیلہ تبسّم ، حافظ آباد ۔ کامران فقیر محمد ، کراچی ۔ ہارون الحسن ، بہاولپور ۔ نگینہ جمال آفریدی ، مردان ۔ شہزاد کنول بھٹی ۔ گلبرگ لاہور ۔ ملیحہ خانم ، راولپنڈی ۔ اطہر رضا ، لالوکھیت کراچی ۔ سیّد ثاقب علی شاہ نقوی ، راولپنڈی ۔ شفیق الرحمٰن ، سرگودھا ۔ میمونہ یوسف ، مظفر آباد آزاد کشمیر ۔ طارق محمود ، شام کوٹ ضلع خانیوال ۔ محمد افضل سراج ، گرجاکھ گوجرانوالہ ۔ عدیلہ خانم ، راولپنڈی ۔ ہما قیوم ، بڈھ بیر ۔ راجہ راشد بشیر ، کراچی نمبر ۵ ۔ طارق محمود ، اٹک ۔ شاز یہ غلام سرور ، شالا مار ٹاؤن لاہور ۔ اختر رسول ، کراچی نمبر ۳/۷ ۔ عدنان طارق خان ، سکھر ۔ صدف معین ، واہ کینٹ ۔ عاصمہ بتول ، چکلالہ راولپنڈی ۔ شبانہ عندلیب ، گوجرانوالہ ۔ فقیعہ رضوی ، اقبال ٹاؤن لاہور ۔ پر مانند کمار، پینو عاقل ۔ سہیل بشیر گوشی ، قصور ۔ ہارون الرشید سلفی ، اسلام آباد ۔ رابعہ حامد ، پشاور ۔ خالد محمود ، اوکاڑہ ۔ عاطف معید ربانی ، ڈھولنوال لاہور ۔ مودود احمد ، کراچی نمبر ۱۸ ۔ مظفر اقبال ، حاجی والہ گجرات ۔ محمد سعید مغل ، لاہور ۔ عمر علی بیگ ، اٹک ۔ سید نازک محمد رضا ، بہاولپور ۔ زبیر علی ، راولپنڈی راجہ کامران افتخار ، جہلم ۔ زینت خان محمد بلوچ ، واہ کوٹ میر پور خاص ۔ سمعیہ رحمان، پشاور

آپ بھی لکھیے

مندرجہ ذیل موضوعات پر کہانی لکھیے اور ایک ہزار روپے کے انعامات حاصل کیجیے

جون ☆ ایک یادگار سفر — جولائی ☆ ہم نے آم کھائے ۔

(آخری تاریخ 10 مئی)

ایڈیٹر تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس لاہور

شاہی باورچی

مُغل بادشاہ اورنگ زیب عالم گیر نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس کے لیے ، دونوں وقت ، نپی تُلی کِھچڑی یا معمولی روٹی پکتی تھی ، جو تمام کی تمام اُس کے دستر خوان پر چلی جاتی تھی اور باورچی کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا تھا ۔ اُسے صرف خُشک تنخواہ پر گزر کرنی پڑتی تھی ۔ اس لیے چند ہی روز میں وہ نوکری چھوڑ کر چلا جاتا تھا ۔

آخر تنگ آکر بادشاہ نے ایک نئے باورچی سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ کم از کم ایک سال تک مُلازمت نہیں چھوڑے گا ۔ باورچی کو یہ معلوم نہ تھا کہ شاہی باورچی خانے میں کیا پکتا ہے اور کتنا پکتا ہے ۔ اس نے بڑی خوشی سے معاہدہ کر لیا ۔ لیکن جلد ہی اس پر ساری حقیقت کُھل گئی اور وہ مصیبت میں پڑگیا ۔

آخر عاجز آکر اس نے سوچا کہ بادشاہ کو اس قدر ناراض کرو کہ وہ خود ہی اُسے نکال دے ۔ لہٰذا اس نے ایک دن کِھچڑی میں بہت زیادہ نمک جھونک دیا۔بادشاہ نے کِھچڑی کھائی ، باورچی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا مگر کہا کچھ نہیں ۔ باورچی نے اگلے دن بالکل نمک نہ ڈالا اور پھیکی کِھچڑی پکائی ۔ بادشاہ نے اس دن بھی کچھ نہ کہا ۔ تیسرے دن باورچی نے نمک کی صحیح مقدار ڈالی بادشاہ نے اس کو نظر اٹھا کر دیکھا اور نہایت تحمّل سے فرمایا کہ میاں صاحب ، ایک ڈھنگ اختیار کرلو ۔ بار بار نمک کی مقدار مت بدلو ۔

باورچی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا اور کہا "حضور! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں"۔

حکم ہُوا "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

باورچی نے عرض کی "جہاں پناہ' میں سات لڑکیوں کا باپ ہوں ۔ شاہی باورچی کہلاتا ہوں مگر حالت یہ ہے کہ فاقوں مرتا ہوں ۔ میں نے یہ سمجھ کر ملازمت کی تھی کہ جہاں پناہ کی خدمت کرکے مال دار بن جاؤں گا مگر اب تو سال بھر تک فاقہ ہی نظر آتا ہے ۔ مہربانی فرما کر خادم کو آزاد کر دیا جائے"۔

بادشاہ نے پوچھا "آزادی چاہتے ہو یا روپیہ؟" باورچی نے عرض کیا کہ روپے کی زیادہ ضرورت ہے ۔ بادشاہ نے کہا "اچھا آج آدھ پاؤ کھچڑی زیادہ پکالینا" ۔ باورچی کچھ نہ سمجھا اور آدھ پاؤ کھچڑی زیادہ پکالی۔ بادشاہ نے اپنے حصّے کی کِھچڑی کھا کر باقی کِھچڑی کے سات حصّے کیے اور سات طشتریوں میں ایک ایک حصہ رکھ کر باورچی کو حکم دیا کہ ہمارے ساتوں وزیروں کو دے آؤ۔ انہیں آج تک بادشاہ کی طرف سے ایسا تُحفہ نہ مِلا تھا۔ ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور انہوں نے باورچی کو ایک ایک لاکھ روپیہ انعام دیا ۔ باورچی یہ سات لاکھ روپیہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے پوچھا "کہو گزارے کی کوئی صورت نکلی؟"

باورچی نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور اب تو عمر بھر کیلئے بے فکری ہوگئی ہے ۔ اب کوئی حاجت نہیں ۔ بادشاہ نے کہا "آئندہ کھچڑی میں نمک ٹھیک ٹھیک ڈالنا"۔ (سجیلہ الطاف میانوالی)

اسلام آباد سے کاغان تک

10 جولائی کی شام کو امّی ، ابُّو نے ہمیں بتایا کہ ہم 13 تاریخ کو کاغان جا رہے ہیں ۔ ہم بہت خوش ہوئے ۔ برسات کا موسم تھا اور خوب بارشیں ہو رہی تھیں ۔ 13 جولائی کو بھی صُبح سے ہی بارش شروع ہو گئی تھی ۔ ہم دس بجے کھانا کھا کر روانہ ہوئے اور ایبٹ آباد پہنچے ۔ وہاں ہم نے ایک رات قیام کیا۔ الیاسی مسجد اور ایبٹ آباد کے بازار وغیرہ دیکھے اور پھر اگلی صبح کاغان کی جانب روانہ ہوئے ۔

ہوائیں چل رہی تھیں ۔ کالی کالی بدلیاں آسمان پر تیر رہی تھیں اور ہم کاغان کی جانب رواں دواں تھے ۔ سڑک کے ساتھ ساتھ دریا بہ رہا تھا ۔ پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی تھین اور ہم ان پہاڑیوں کو دیکھتے ، خُدا کی عظمت کے گیت گاتے ، اس کے بنائے ہوئے مناظر کو سراہتے ، کاغان کی جانب گامزن تھے ۔ ہم تقریباً 3 بجے کاغان پہنچے اور ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ۔ ہمارے کمرے کی کھڑکی دریا کی جانب کُھلتی تھی اور یہاں سے ہم بہ آسانی دریا کی موجوں کی

اٹھکیلیاں دیکھ سکتے تھے۔ رات ہم نے اسی ریسٹ ہاؤس میں گزاری اور اگلے دن جھیل سیف الملوک کی طرف روانہ ہوئے ۔

سیف الملوک کو دیکھتے ہی ہمیں اپنی پانچویں کتاب کا مضمون "کاغان کی سیر" یاد آگیا ۔ اتنا خوبصورت اتنا پیارا منظر ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ جھیل کے کنارے رنگ برنگ پھول اُگے ہوئے تھے جن پر تتلیاں منڈلارہی تھیں۔شفاف نیلے پانی پر پہاڑیوں کا عکس بہت خُوش نما لگ رہا تھا ۔ ہم نے آدھا دن اس جھیل کے کنارے گزارا اور بہت سے نظاروں کو کیمرے میں محفوظ کرکے واپس ہوئے ۔

کاغان جتنا خوبصورت اور پُرفضا مقام ہے ، وہاں کے لوگ اتنے ہی غریب ہیں ۔ ان کے پاس آج کے دور کی سہولتیں اور آسائشیں نہیں لیکن انکے دل خلوص اور انسانی ہمدردی سے پُر ہیں ۔ ان کے گھروں میں بجلی اور گیس نہیں لیکن امن کی روشنی ہے ۔ انسانی ہمدردی جس کا آج کل کال پڑا ہوا ہے ، ان لوگوں میں کثرت سے موجود ہے ۔ میں حکومت پاکستان سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ کاغان کے لوگوں کو تعلیم اور روزگار کی سہولتیں فراہم کرے تاکہ وہ بھی ملک کی ترقّی میں اپنے ہم وطنوں کا ہاتھ بٹائیں۔ (سیدہ صدف عرفان ۔ اسلام آباد)

پُراسرار موت

اجمل صاحب ایک پرائیویٹ فرم کے مینجر تھے ۔ ایک صُبح وہ دفتر پہنچے تو اُن کی میز پر فائلوں کا ڈھیر لگا ہُوا تھا ۔ اُنہوں نے باری باری سب فائلیں پڑھنا شروع کیں ۔ حسبِ معمول آج بھی ان میں لگی ہوئی پنوں کو نکال کر اپنے دانتوں تلے دبا رہے تھے ۔ یہ اُن کی بچپن کی عادت تھی۔ ابھی وہ کام میں مصروف تھے کہ فون کی گھنٹی بجی ۔ اُنہوں نے رسیور اُٹھایا ۔ مگر اِس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتے ، فون اُن کے ہاتھ سے گر گیا اور اُن کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی ۔

لوگ حیران تھے کہ ایک صحت مند آدمی اچانک وفات کیسے پاگیا؟ بہر حال جب پولیس نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ اجمل صاحب کی موت دِل کا دورہ پڑنے کی بجائے زہر دینے سے ہوئی ہے ۔ ان کا ایک دُشمن ان کی اس عادت سے واقف تھا کہ وہ فائلیں چیک کرتے وقت پِنوں کو دانتوں میں دباتے جاتے ہیں ۔ اُس نے فرم کے ایک کلرک سے مل کر کاغذات میں لگی ہوئی چند پنوں پر خطرناک زہر لگا دیا تھا ۔ (اِمتیاز حُسین ۔ ناروے)

عِلم اور دولت

بیس آدمیوں کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ علم اور دولت میں فرق بتائیں ۔

حضرت علیؓ نے فرمایا :

دولت فرعون کا ورثہ ہے اور علم انبیاءؑ کا عطیہ ۔ دولت کی حفاظت تم کرتے ہو اور تمہاری حفاظت علم کرتا ہے ۔ جس کے پاس دولت ہو اس کے بہت سے دُشمن ہوتے ہیں اور جس کے پاس علم ہو اسکے بہت سے دوست ہوتے ہیں ۔ دولت بانٹی جائے تو کم ہو جاتی ہے ۔ علم بانٹا جائے تو بڑھ جاتا ہے ۔

دولت مند کنجوس ہوتا ہے اور عالم سخی ۔ دولت چرائی جاسکتی ہے ۔ علم چُرایا نہیں جاسکتا ۔ دولت وقت کے ساتھ گھٹتی ہے ۔ علم کبھی نہیں گھٹتا دولت سے دل و دماغ سیاہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن علم سے تاب ناک اور روشن۔دولت محدود ہے ۔ اسکا حساب ہوتا ہے ۔ علم لامحدود ہے۔اسکی کوئی انتہا نہیں۔ دولت نے فرعون اور نمرود جیسے خدائی کا دعویٰ کرنے والے پیدا کیے ۔ علم نے انسان کو سچّے معبود سے رُوشناس کرایا ۔ (محمد سلیم جان مروت بنّوں)

گھوڑے کا فیصلہ

ایک دفعہ ایک قاضی خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ایک جھگڑا ایسا ہے جس کا میں فیصلہ نہیں کرسکا ۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس

جھگڑے کو جو کہ دو آدمیوں کے درمیان ایک گھوڑے کیلئے ہے ، نپٹائیں ۔ ان دونوں میں سے ہر ایک قسم کھاتا ہے کہ گھوڑا میرا ہے ۔
خلیفہ نے کہا کہ دونوں کو پیش کیا جائے ۔
ان میں ایک امیر نظر آتا تھا اور دوسرا غریب وہ لنگڑا بھی تھا اور لاٹھی ٹیک کر چلتا تھا ۔ خلیفہ نے پہلے امیر آدمی کو ساری بات بیان کرنے کو کہا ۔ امیر آدمی تھوڑا آگے آیا اور عرض کرنے لگا :
"اے امیر المؤمنین! میں صبح گھوڑے پر سوار ہو کر شہر جارہا تھا کہ میں نے اس فقیر کو لنگڑاتے ہوئے سڑک کے کنارے چلتے دیکھا ۔ اِس کے قریب پہنچا اور پوچھا کہ کہاں جانا ہے ۔ اس نے کہا کہ شہر۔ مجھے اس پر ترس آگیا اور میں نے اسے سہارا دیکر اپنے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھالیا ۔ جب ہم شہر کے پھاٹک پر پہنچے تو میں پیچھے مڑا کہ اس کو سہارا دیکر نیچے اُتاروں لیکن اسنے نیچے اترنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ میں کیوں نیچے اُتروں تم اُترو۔یہ گھوڑا میرا ہے"۔
یہ کہہ کر امیر آدمی خاموش ہوگیا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر فقیر کے برابر ادب سے کھڑا ہوگیا۔ اب خلیفہ نے فقیر سے کہا کہ آگے آؤ اور اپنی سرگزشت سناؤ۔ فقیر ایک قدم آگے بڑھا اور کہنے لگا :
"اے امیر المومنین! یہ گھوڑا میرا ہے ۔ اب آپ سوچیں گے کہ مجھ جیسے غریب کے پاس اتنا قیمتی گھوڑا کہاں سے آیا ۔ لیکن اے امیر المومنین! میری یہ حالت اس گھوڑے ہی کی وجہ سے ہے ۔ میرے پاس جتنی رقم تھی ، اس کا میں نے گھوڑا لے لیا۔اب میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ۔ میں بھیک مانگتا ہوں جس سے اپنے لیے دو وقت کی روٹی اور گھوڑے کے لیے چارے کا انتظام کرتا ہوں ۔ میں بہت غریب ہوں ۔ لیکن اپنے گھوڑے سے بہت پیار کرتا ہوں اور اسکی اپنے سے زیادہ دیکھ بھال کرتا ہوں ۔
"آج صبح میں گھوڑے پر شہر جا رہا تھا کہ راستے میں مجھے یہ شخص ملا ۔ یہ سڑک کے کنارے پیدل جارہا تھا۔ جب اس نے میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُنی تو واپس مڑا اور مجھ سے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو۔ جب میں نے بتایا کہ شہر جا رہا ہوں تو اس نے کہا کہ مجھے بھی لے چلو ۔ یہ گھوڑے پر میرے آگے بیٹھ گیا اور کہا کہ جب شہر آجائے گا تو میں اُتر جاؤں گا لیکن جب شہر کا پھاٹک آیا تو یہ نہیں اُترا اور اُلٹا مجھ سے کہا کہ تم نیچے اترو ۔ میں نے کہا کہ گھوڑا میرا ہے ۔ تم نیچے اُترو ۔ اگر تم مجھ سے یہ گھوڑا چھین لو گے تو میں عدالت میں جاؤنگا ۔ اس نے کہا کہ اگر تم عدالت میں جاؤ گے تو تمہاری بات پر کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ ایسے گھوڑے تو ہم جیسے لوگوں کے ہوتے ہیں نہ کہ تمہارے جیسے لوگوں کے ۔
"اے امیر المومنین! میں نے آپ کے انصاف کا بہت چرچا سُنا ہے ۔ خدا کے لیے مجھے اس امیر آدمی کے ظلم سے بچائیے۔یہ مجھے لوٹنا چاہتا ہے"۔
یہ سب کچھ سُننے کے بعد خلیفہ نے کہا "یہ بہت آسان فیصلہ ہے۔اُس نے پہلے فقیر سے کہا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے۔ فقیر نے گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا تو گھوڑا بدکا ، جیسے اسنے فقیر کے ہاتھ کو ناپسند کیا ہو ۔ اور جب امیر آدمی نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھّا تو وہ خوشی سے ہنہنایا جیسے اس نے اپنے مالک کے ہاتھ کو پسند کیا ہو۔خلیفہ نے گھوڑا امیر آدمی کے حوالے کر دیا اور فقیر کو سخت سزادی۔ (محمد زبیر مڈ رانجھا)

اخلاقی سبق

اپنے اندر عاجزی پیدا کرو کیونکہ پھل دار درخت ہمیشہ جھکے ہوتے ہیں ۔
شمع کی طرح زندگی بسر کرنا سیکھو جو خود تو جلتی ہے لیکن دوسروں کو روشنی دیتی ہے ۔
خود ہر ایک سے اخلاق سے پیش آؤ لیکن دوسرے سے ہر گز یہ تمنّا نہ کرو کہ وہ بھی تمہارے ساتھ اخلاق سے پیش آئے گا ۔
دُنیا داری اتنی نہ بڑھاؤ کہ دِین کو بُھول جاؤ ۔
ہر دِن کو اس طرح صرف کرو کہ وہ تمہارے لیے یادگار بن جائے ۔
دُنیا میں کامیابی صرف انھی لوگوں کا مقدّر بنتی ہے جو محنت سے کام کرتے ہیں۔ (ثمرین ریاض لاہور)

سچّا لڑکا

پُرانے زمانے میں ایک بادشاہ تھا ۔ اُس کا کوئی بچّہ نہ تھا ۔ جب وُہ بوڑھا ہوگیا تو اُسے فِکر ہوئی کہ اُس کے مرنے کے بعد تخت و تاج کا وراث کون ہو گا ۔

ایک دِن اُس نے سارے مُلک میں اعلان کرایا کہ وُہ اِیک ایسا بچّہ چُننا چاہتا ہے جو اُسکے تخت و تاج کا وارث ہو ۔ چُننے کا طریقہ یہ ہوگا کہ ہر بچّے کو ایک ایک بیج دیا جائے گا ۔ اور جس بچّے کے بوئے ہُوئے بیج کے پودے میں سب سے خُوب صُورت پُھول کِھلے گا ، وُہ بادشاہ بنا دیا جائے گا ۔

محمُود بھی اُن لڑکوں میں شامل تھا ۔ اس نے بھی بادشاہ سے اِیک بیج لیا اور گھر واپس آکر بیج کو گملے میں بو دیا ۔ وُہ ہر روز اُسے پانی دیتا ۔ اُسے اُمید تھی کہ اُس کے پودے میں سب سے خوب صورت پُھول کِھلے گا ۔

دِن گزرتے رہے مگر گملے میں پُھول تو پُھول پتّا بھی نہ اُگا ۔ محمود کو بڑی فکر تھی ۔ اُس نے ایک اور گملا خریدا اور دُور دُور سے جا کر زرخیز مٹّی لایا اور اُس بیج کو دوبارہ احتیاط سے لگایا ۔ مگر گملے میں کوئی پودا نہیں اُگا ۔ آخر وہ دِن آ پہنچا جب بادشاہ نے بچّوں کے پُھول دیکھنے تھے ۔ سارے بچّے شاہی محل میں جمع ہُوئے ۔ ہر بچّہ اپنے ہاتھوں میں گملا لئے کھڑا تھا ۔ گملوں میں رنگ برنگے پھول کِھلے ہوئے تھے جو واقعی بڑے خُوب صُورت تھے ۔

بادشاہ پُھولوں کو دیکھنے بچوں کے پاس آیا ۔ وُہ ایک خُوب صُورت پھول کو دیکھ رہا تھا مگر اُس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں ۔ وُہ بالکل خاموش تھا ۔ اچانک اُس کی نظر محمُود پر پڑی جو اِیک خالی گملا لئے سر جھکائے کھڑا تھا ۔

بادشاہ محمُود کے پاس گیا اور کہا بیٹے! تُم خالی گملا لیے کیوں کھڑے ہو؟"

محمُود روتے ہوئے بولا "میں نے وُہ بیج گملے میں بویا اُسے روز پانی دیتا ۔ لیکن اُس میں پودا نہیں اُگا ۔ مجھے یہ خالی گملا لے کر یہاں آنا پڑا ۔"

یہ بات سُن کر بادشاہ بہت خُوش ہوا ۔ اُس نے کہا "تم اِیک سچّے لڑکے ہو ۔ میں اپنے تخت و تاج کے لیے تم جیسے لڑکے کو چُنتا ہوں ۔ تُم ہی آئندہ اِس ملک کے بادشاہ ہو گے ۔"

بات یہ تھی کہ جو بیج بادشاہ نے تقسیم کئے تھے وہ خراب تھے اُن سے پودا اُگنے اور اِس پر پھُول کھِلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ دوسرے بچے اسلئے خوبصورت پھول کھلانے میں کامیاب ہوئے تھے کہ اُنہوں نے خراب بیج کی جگہ اچھے بیج بوئے تھے ۔ مگر محمود نے یہ غلط حرکت نہیں کی تھی ۔ کیونکہ وُہ نیک اور سچّا لڑکا تھا ۔ نیکی اور سچّائی کبھی بیکار نہیں جاتی ۔ اِسکا بدلہ انسان کو کبھی نہ کبھی ضرور ملتا ہے ۔

عدیل رضا

نماز

نماز پڑھنے سے روزی میں برکت ہوتی ہے ۔
نماز قبر میں روشنی کا ذریعہ ہو گی ۔
نماز کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی ۔
نماز اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا سب سے بڑا وسیلہ ہے ۔
نماز بُری باتوں اور بے حیائی سے بچاتی ہے ۔
نماز پڑھنے والوں کے تمام کام باقاعدگی سے ہوتے ہیں ۔
نماز جنّت کی کنجی ہے ۔
نماز مومن کی معراج ہے ۔
نماز اسلام کی بُنیاد ہے ۔
نماز قیامت کے دِن نمازی پر سایہ کرے گی ۔
نماز مساوات اور عدل و انصاف کا درس دیتی ہے ۔
نماز قبر میں منکر نکیر کو مُردے کی طرف سے جواب دے گی ۔
نماز مومن کے دِل کا نُور ہے ۔

سجّاد ثمر، شجاع آباد

کُکڑوں کُوں

مقبول انور داؤدی

ایک دِن اکبر بادشاہ باغ میں حوض کے کِنارے اپنے آٹھ رتنوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بات ہو رہی تھی کہ مُلّا دوپیازہ ہر ایک پر وار کر جاتا ہے۔ مگر خود ہار نہیں کھاتا۔ بیربل نے کہا، مہاراج آج مُلّا دوپیازہ ضرور ہار جائے گا۔

اکبر نے پوچھا وہ کیسے؟

بیربل نے کہا کہ ہم اِس حوض میں آٹھ انڈے رکھ دیتے ہیں۔ جب مُلّا دوپیازہ آئے تو آپ باری باری سب سے کہیں کہ جاؤ حوض سے انڈا نکال لاؤ۔ جب سب انڈے نکال لیے جائیں۔ تو مُلّا دوپیازہ سے انڈا لانے کو کہا جائے۔ اس طرح وہ ہار جائے گا۔

اکبر کو یہ تجویز پسند آئی۔ چنانچہ آٹھ انڈے حوض میں رکھ دیے گئے۔

اتنے میں مُلّا دوپیازہ بھی آگئے۔ تھوڑی دیر بعد اکبر نے ایک رتن سے کہا کہ حوض سے انڈا نکالو۔ وہ انڈا نکال لایا۔ اس طرح بادشاہ نے سب سے کہا اور وہ حوض سے باری باری انڈا لے آئے۔

اب مُلّا دوپیازہ کی باری تھی۔ اکبر نے کہا: مُلّا جی! اب آپ بھی حوض سے انڈا لائیں۔ مُلّا جی حوض میں کُود پڑے۔ بہت ڈھونڈا مگر کوئی انڈا نہ مِلا۔ مُلّا صاحب نے پانی سے سر نکالا۔ اور بلند آواز میں کہا۔

"ککڑوں کُوں"

اکبر نے پوچھا "مُلّا جی یہ کیا؟ انڈا لائے ہو؟"

مُلّا نے کہا "حضور! اتنی مُرغیوں میں ایک مُرغا بھی تو ہونا چاہئے"

دماغ لڑاؤ

داؤدی علمی آزمائش

1. جنگِ فجار کن دو قبیلوں کے درمیان ہوئی تھی، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عمر کیا تھی؟
2. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مدینہ کے یہودیوں میں جو معاہدہ ہُوا تھا اسے کس نام سے یاد کیا جاتا ہے؟
3. حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مسلمان، کفارِ مکہ کے بائیکاٹ کے باعث کہاں اور کتنی مدت مکے سے باہر رہے؟
4. حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہؓ سے بیعت لی۔ قرآن میں اسے کس نام سے بیان کیا گیا ہے؟
5. یہ بتایئے کہ یہ بیعت کیوں لی گئی تھی؟
6. عکرمہ سب سے بڑے کافر ابوجہل کا بیٹا تھا اس کا انجام کیا ہُوا؟
7. فتح مکہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کونسی آیت پڑھکر کفارِ مکہ کو معاف کر دیا تھا؟
8. ہندہ کون تھی اور اُس نے کیا ناگوار کام کیا تھا؟
9. حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا آپس میں کیا رشتہ تھا؟
10. حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کس نے شہید کیا تھا؟
11. حجاج بن یوسف ثقفی ایک ظالم گورنر تھا یہ بتایئے کہ اُس نے عجمی مسلمانوں پر کیا بڑا احسان کیا ہے؟
12. حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ کتنی مدت تک خلیفہ رہے؟
13. کفارِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان پہلا معرکہ کہاں اور کس سن ہجری میں ہُوا؟
14. سفاح کے معنی بتایئے اور اس کا اصل نام کیا تھا؟
15. سفاح کو تاریخ میں کیا اہمیت حاصل ہے؟

جواب مختصر ہونے چاہئیں۔

نوٹ: ایک سے زیادہ صحیح حل موصول ہونے کی صورت میں انعامات بذریعہ قرعہ اندازی دیئے جائیں گے۔ یہ انعامات 1000 ہزار روپے کی کتابیں ہوں گی۔

اپریل 1989 کا

بنیادی لفظ: منصور احمد

پہلا انعام ۔ ایک سو روپے کی کُتب ۔ فرخ شریف آپٹیکل شاہی بازار بہاول پور ۔ 220

دوسرا انعام ۔ 75 روپے کی کُتب ثاقب حسین زیدی مکان نمبر 680/42 گلی نمبر 73 بزاز محلّہ ۔ صدر بازار لاہور کینٹ ۔ 210

تیسرا انعام ۔ 50 روپے کی کُتب ۔ رفعت زیدی، لاہور کینٹ ۔ 209

پچیس پچیس روپے کی کُتب کا انعام حاصل کرنے والے۔

1 – سیّد محمد سلیمان 330/c سٹیلائٹ ٹاؤن بہاول پور 207
2 – فریحہ زیدی بزاز محلّہ ۔ صدر بازار لاہور کینٹ 190
3 – فرحان عارف 341 ۔ سی، سٹیلائٹ ٹاؤن ، بہاول پور 182
4 – محمد یٰسین کلاس دہم گورنمنٹ سٹیلائٹ ٹاؤن ہائی سکول بہاولپور 157

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ اس کوپن کا بھیجنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 مئی ہے۔

نام ________ عمر ________

پتا ________

5 – غلام مصطفیٰ ولد نبی بخش محلّہ حقداد آباد تحصیل و ڈاکخانہ بکسرات ضلع بنوں 152
6 – محمد ہاشم صدیقی ہشتم نشتر رول نمبر 5 گورنمنٹ ہائی سکول شجاع آباد ضلع ملتان 152
7 – محمد امجد جماعت نہم گورنمنٹ ہائی سکول بڈہ بیر تحصیل و ضلع پشاور 152
8 – ایم فرخ سلیم 753/c سٹیلائٹ ٹاؤن بہاول پور 148
9 – محمد عاصم صدیقی مکان نمبر 460 وارڈ نمبر 4 اندرون شیشا گیٹ تھے خاں شجاع آباد 130
10 – اختر بادشاہ ولد میر بادشاہ محلّہ حقداد آباد ضلع بنوں 130
11 – مہر گل ریلوے کانونی ملتان 128
12 – ریحان حسین ولد قربان پریمٹر کالونی کوارٹر نمبر 220 گلی نمبر 2 فیصل آباد 118
13 – سیّدہ صدف عرفان اسلام آباد 116
14 – عدیل حسیب 300/ ایف رحمان پورہ لاہور 110
15 – سونیا صدف سیٹلائٹ ٹاؤن بہاول پور 104
16 – سیّد حماد افضل 18–B گلگشت کالونی ملتان 98
17 – عائشہ تصوّر 52/A ماڈل ٹاؤن B بہاول پور 94
18 – احمر فیضان بابر 620 ۔ بی ، پیپلز کالونی فیصل آباد 86
19 – محمد عابد معرفت عمر حیات کلر مرچنٹ گول بازار کامونکے منڈی ضلع گوجرانوالہ 85
20 – مظہر عبید خاں معرفت حاجی لطف محمد خاں 26/A سیٹلائٹ ٹاؤن بہاول پور 84
21 – مرزا محمد علی 113–F بکرمنڈی بورے والا 83
22 – شہباز احمد ولد منشی محمد صدیق نزد ڈاکٹر سردار چیمہ محلّہ اسلام آباد ۔ کامونکے ضلع گوجرانوالہ 82

ضروری وضاحت: اس مرتبہ سینکڑوں بچّوں نے بنیادی لفظ درست نہ لکھا جس کے باعث شریک مقابلہ نہ ہوسکے ۔ حل پہلے سے ہی محفوظ کر لیا جاتا ہے اب ایک معلوماتی معما شروع کیا گیا ہے ۔ آپ لکھیں کہ آپ کسے زیادہ پسند کرتے ہیں ۔

ضروری ہدایت: اپنا پتہ صحیح اور خوشخط لکھا کریں کوپن کے علاوہ حل پر بھی اپنا مکمل پتہ تحریر کریں ۔

ہمارا تیسرا کامک
انشاءاللہ اگلے مہینے سے شروع
ہوگا۔
پاک و ہند کا
عظیم مسلمان
فرماں روا
شیر شاہ سُوری
اُس کا اصل نام فرید خان تھا وہ صوبہ بہار کے علاقہ سہسرام کے ایک پٹھان زمیندار قبیلے کا چشم و چراغ تھا۔
اُس نے جون پور میں تحصیل علم کیا۔ قدرت نے اسے توانا جسم اور بلا کا ذہن عطا کیا تھا غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے اُسے شیر خان کا لقب ملا اور بادشاہ بنتے ہی وہ شیر شاہ کہلوانے لگا۔
وہ سراپا طلسماتی شخصیت تھا۔ اُس کے محیر العقل کارناموں سے یوں گمان ہوتا ہے جیسے وہ کوئی طاقتور جن تھا۔ پانچ سالہ دورِ حکومت میں عدل و انصاف اَمن و اَمان اور تعمیر و ترقی کا ایسا عمدہ نظام رائج کیا جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔
عوام اُسے "سُلطانِ عادل" کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔ جہلم کے قریب قلعہ رہتاس اور جی۔ ٹی روڈ (شاہراہِ پاکستان) اِس عظیم بادشاہ کی یاد دلاتے ہیں
عوام کو بنیادی سہولتیں مہیا کرنے والا پاک و ہند کا پہلا مسلمان بادشاہ

چاند کا سفر

ابرار محسن

فیسی لکڑبگھا سمندر کے کنارے ایک جھاڑی میں سو رہا تھا ۔ وہ مُردہ اور سڑے ہوئے بدبودار جانوروں کے رسیلے خواب دیکھ رہا تھا ۔ ان خوابوں کی وجہ سے ہی اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

سونے سے پہلے وہ ایک ہرن کے بچّے کا تعاقب کر رہا تھا ۔ مگر وہ اس کے ہاتھ نہ آیا ۔ آخر تھک ہار کر وہ یہاں آکر سو گیا تھا۔ خواب میں بھی وہ ہرن کا پیچھا کرتا رہا ۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے چاروں طرف مردہ جانور بکھرے ہوئے ہیں ۔ پھر وہ ہرن کا پیچھا کرنے لگا۔ ہرن بھاگ گیا ۔ فیسی نے غصّے میں دانتوں سے اپنی زبان کاٹ لی۔ درد سے تڑپ کر اسکی نیند ٹوٹ گئی ۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا ۔ یہی وقت تھا جب وہ شرارتیں کرتا تھا۔ اندھیرے میں چھوٹے جانوروں کو بس فیسی کا ہی خوف رہتا تھا ۔ وہ کہیں بھی ، کسی بھی ، جھاڑی میں سے اچانک نکل کر کسی خرگوش، ہرن یا بکری کے بچّے پر جھپٹ سکتا تھا ۔

تھوڑی دیر میں سمندر کے پانی میں سے چاند کا جگ مگ کرتا ہوا گولا اُبھرا ۔ اسی وقت سمندر کی سمت سے آنے والی ہوا کے جھونکے مچھلیوں کی میٹھی خوشبو کے ریلے فیسی کی ناک تک لائے ۔

پورا چاند فیسی کو پاگل بنا دیتا تھا۔ بس اس کا دل چاہتا کہ جانوروں کو خوب دُکھ دے ۔ انھیں پکڑ کر دانتوں سے ان کی کھال اُدھیڑ دے اور ہڈّیاں چبا جائے ۔

اسی وجہ سے چاندنی راتوں کو کلُولُو خرگوش کی مشغُولیت اور بھی بڑھ جاتی تھی ۔ وہ اسی فکر میں پھرتا رہتا کہ کہیں فیسی کسی کو ستا تو نہیں رہا ہے ۔ کلُولُو بس بے خبر جانوروں کو فیسی کے خطرے سے آگاہ کرتا اور انہیں اس کے پنجوں سے آزاد کراتا ۔ کلُولُو فیسی سے بے حد ناراض تھا۔ کل ہی تو اس لکڑبگھے نے کلُولُو کے دوست ہرن کو زخمی کر دیا تھا ۔ قسمت اچھی تھی جو ہرن جان بچا کر بھاگ نکلا تھا۔ اسی وجہ سے کلُولُو نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ لکڑبگھے کو مزہ چکھائے گا ۔

"فیسی!" ایک آواز آئی ۔

فیسی زبان کٹ جانے کی وجہ سے جھنجھلایا ہوا تھا ۔ غصے سے پوچھا "کون ہے ؟"

آواز آئی "یہ جاننے کی کوشش نہ کرو ۔ غور سے میری بات سنو ۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ایسی مزیدار چیز کھانے کو مل جائے جسے کھا کر تمہیں پھر کبھی بھوک نہ ستائے ؟ یا وہ چیز ہی کبھی ختم نہ ہو؟"

"ہاں ہاں" وہ جلدی سے بولا ۔

آواز نے پھر سوال کیا "چاند میں تم کیا دیکھتے ہو ؟"

فیسی ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا "خرگوش ۔ میری دادی نے بتایا تھا۔ اُف ! میرا کس قدر جی چاہتا ہے کہ اس خرگوش کو نوالہ بناؤں مگر اس تک پہنچوں کیسے ؟"

آواز آئی "وہ خرگوش ایسا ہے کہ تم تمام زندگی کھاتے رہو پھر بھی ختم نہ ہو ۔ تم وہاں جا سکتے ہو ۔ جنگل کے باہر چاند گاڑی کھڑی ہے جس میں گھاس بھری ہے جو کہ خرگوش کے لئے چاند پر لے جائی جا رہی ہے ۔ بس جلدی سے جاؤ اور گھاس کے گٹھے میں جا بیٹھو ۔ جب چاند پر سے واپس آؤ تو اسی جگہ آ کر میرا شکریہ ادا کرنا نہ بھولنا" فیسی خوشی سے چلّایا اور اسی وقت دوڑ اٹھا۔

ایک کسان بیل گاڑی میں گھاس کے گٹھے لیکر شہر کی منڈی میں بیچنے جا رہا تھا ۔ راستے میں گاڑی کا ایک پہیا ٹوٹ گیا ۔ کسان کے ساتھ اس کے چند ساتھی بھی تھے۔وہ ان کے ساتھ پہیا درست کروانے چلا گیا ۔ گاڑی وہیں کھڑی رہی ۔ ایک گٹھے کی رسّی ٹوٹ گئی تھی اور وہ کھلا ہوا تھا۔

فیسی اسی گٹھے میں آ بیٹھا اور چاند گاڑی کے اُڑنے کا انتظار کرنے لگا ۔ وہ کسان کی بیل گاڑی کو چاند گاڑی سمجھا تھا ۔

تھوڑی دیر میں کسان اور اس کے ساتھی واپس لوٹ آئے ۔ انہوں نے پہیا لگایا ، بیل جوتے اور کھلے ہوئے گٹھے کو اس مضبوطی سے رسّی سے باندھا کہ فیسی کی آنکھیں نکل پڑیں ، ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں ۔ اُف! وہ گٹھے میں جکڑا جا چکا تھا ۔ اور جب چاند گاڑی روانہ ہوئی تو ایسے جھٹکے لگے کہ اسکی ہڈی پسلی برابر ہو گئی۔اسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔

اس کے ساتھ ہی وہ کسی کتے کی خوفناک آواز بھی سن رہا تھا۔

شاید یہ چاند کا کتّا تھا اور چاند گاڑی کے ساتھ ساتھ اُڑ رہا تھا ۔

فیسی نے گٹھے میں سے نکلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا ۔ چاند گاڑی ہوا میں لڑھکتی جا رہی تھی اور وہ حیران پریشان اپنی قسمت کو کوس رہا تھا ۔

"میری بدبختی ہی تھی جو مجھے اس وبال میں پھنسنا پڑا ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ چاند کا سفر اس قدر خوفناک ہوگا۔ ہائے ! میں کیا کروں"؟

آخر گاڑی چاند پر پہنچ گئی ۔

دن کا وقت تھا۔گٹھے اُتارے جانے لگے ۔ بہت سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں ۔۔۔۔ پھر فیسی والا گٹھا کھولا گیا ۔

"ارے گھاس کے اندر لکڑبگھّا !" بہت سی آوازیں آئیں۔

اب فیسی نے دیکھا وہ آدمیوں میں گھرا ہوا ہے۔اتنی دیر جکڑے رہنے کی وجہ سے اس کا بدن اکڑ کر رہ گیا تھا ۔ وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا ۔

"پکڑو!مارو ! جانے نہ پائے!" اور فیسی پر لاٹھیاں برسنے لگیں۔ وہ بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوا ۔ کتے اسے بھنبھوڑنے لگے ۔

"آہ! اوہ!" وہ گھسٹتا ہوا اسی جھاڑی کے پاس آیا ۔ "کیوں کیسا رہا سفر؟" "سفر تو اچھا رہا" وہ بے شرمی سے بولا"مگر چاند گاڑی بہت زور سے زمین پر اتری ۔ آہ! ہائے"!

فیسی بری طرح کراہتا ہوا چلا گیا ۔ جھاڑی میں کلولو خرگوش ہنستے ہنستے بے حال ہو رہا تھا۔
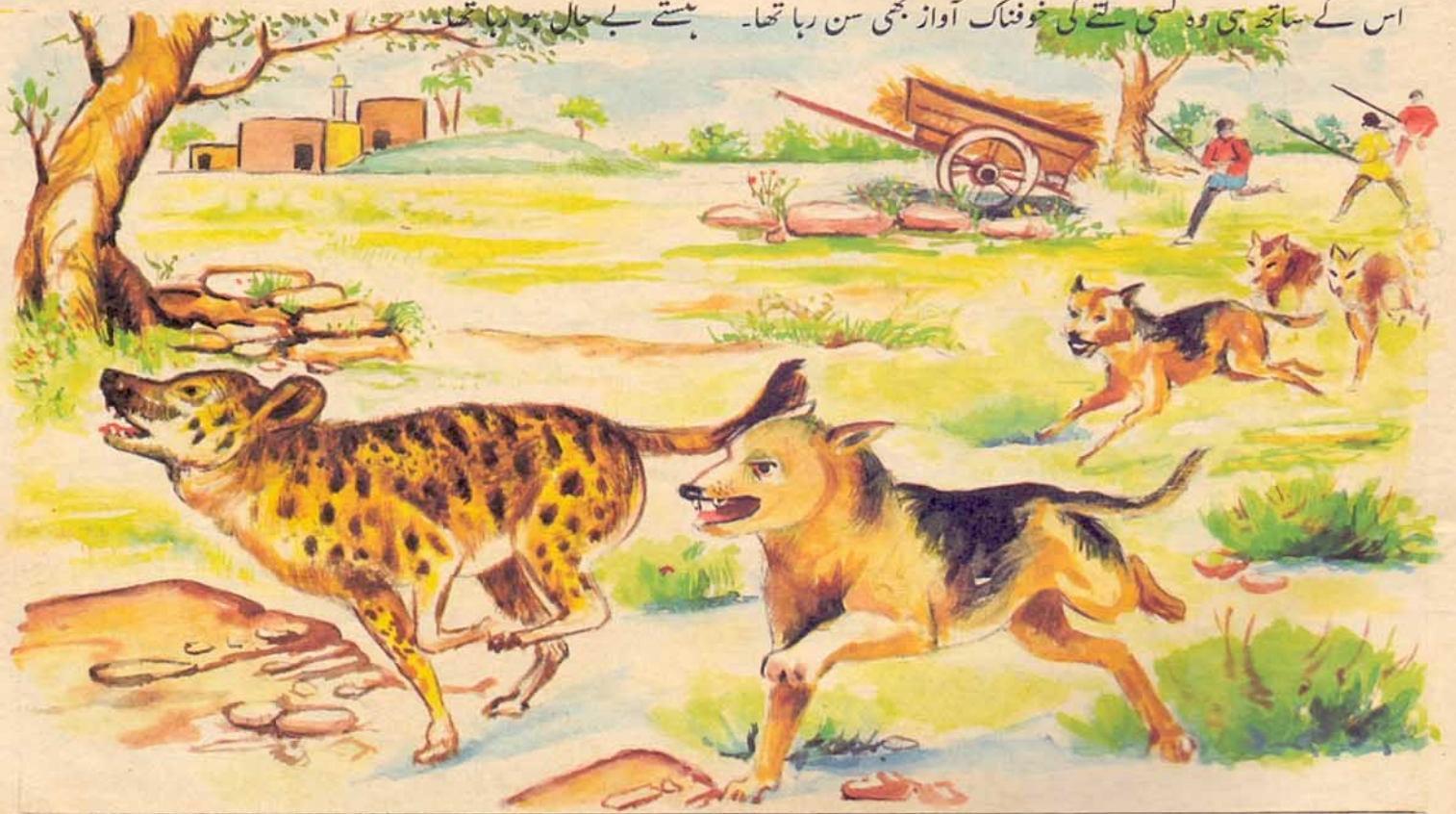
انڈے سے تتلی تک
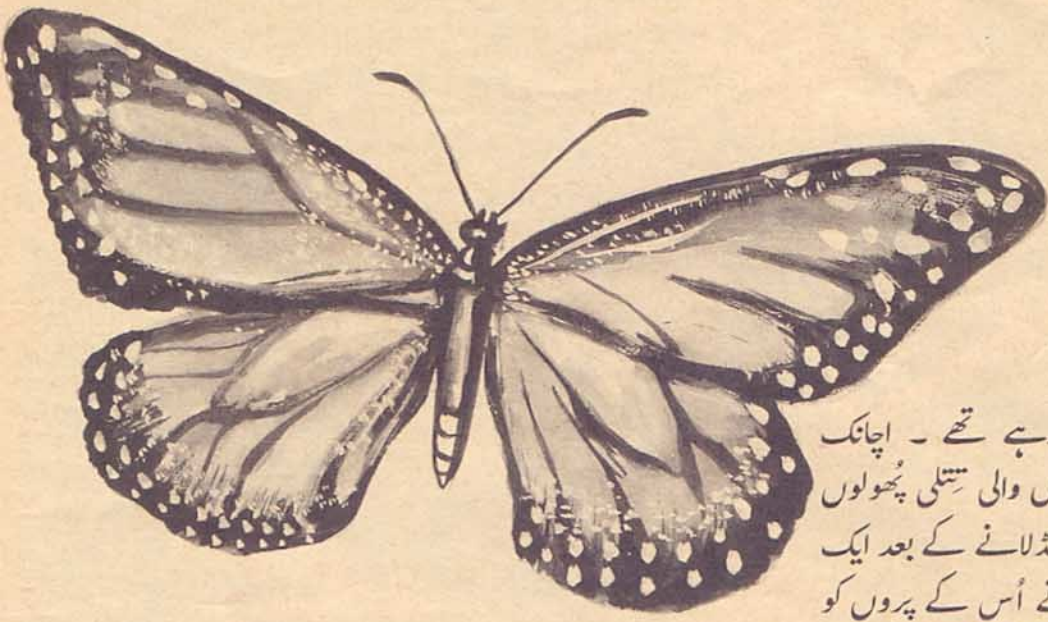
عُثمان اور عمران لان میں کھیل رہے تھے ۔ اچانک عُثمان نے دیکھا ایک خوبصورت رنگین پروں والی تتلی پھولوں کے گرد چکّر لگا رہی ہے ۔ وہ اِدھر اُدھر منڈلانے کے بعد ایک پُھول پر بیٹھ گئی ۔ عثمان کے ہاتھوں نے اُس کے پروں کو چُھو لیا تھا اس لیے اُسکے ہاتھوں پر پروں کا رنگ لگ گیا تھا ۔ تتلی اب کچھ فاصلے پر دوسرے پھولوں کے اُوپر اُڑ رہی تھی۔ عِمران نے عُثمان سے پوچھا "تم بھاگتے کیوں نہیں؟ کھیلنا نہیں ہے؟"

"مانی بھیا، میں تتلی پکڑ رہا تھا" عُثمان نے کہا اور جلدی سے تتلی کی طرف لپکا۔ یہ اِتفاق ہی تھا کہ تتلی ایکدم اس کے ہاتھ میں آگئی ۔ دونوں بھائی خُوشی سے چیخ اُٹھے۔ عمران نے عُثمان کو تتلی دِکھائی اور بولا "دیکھو عثمان ، اسکے پر کتنے خوبصورت ہیں"۔

"ہاں رنگ برنگے ہیں"۔ عثمان نے کہا۔ "مجھے بھی دیں"۔

"تمہارے ہاتھ سے اُڑ جائے گی ۔ دیکھو، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اِس کے جسم کے کتنے حصے ہیں"۔

"چلیں بتائیے" عُثمان نے کہا۔

"دیکھو، یہ بھی ایک طرح کا کیڑا ہی ہے۔ اس کے جسم کے تین حصّے ہوتے ہیں ۔ یہ دیکھو یہ سب سے اُوپر والا حصّہ ہے ۔ اِس پر دو موٹی موٹی آنکھیں ہیں ۔ ایک لمبی سُونڈ ہے اور دو حاسّے یا اَنٹینے ہیں۔ سر کے بعد صدر ہوتا ہے ۔ اس پر تین جوڑے ٹانگوں کے اور دو جوڑے پروں کے ہیں۔ اور آخری حصہ شِکم یا پیٹ ہوتا ہے"۔

ابھی عمران نے اتنا ہی بتایا تھا کہ بھائی جان لان میں آ نکلے ۔ انہوں نے پُوچھا کیا کر رہے ہو بھئی؟

"ہم تتلی کا مُشاہدہ کر رہے ہیں"۔ عمران نے بتایا ۔

"دیکھئے ۔ کتنی پیاری تتلی ہے"۔

"پیاری تو ہے مگر تم نے اس بے چاری کو پکڑا کیوں؟"

"ہم اس کا مُشاہدہ کرنا چاہتے تھے"۔ عمران نے بتایا۔

"اچھا تو پھر کر لیا مُشاہدہ؟" بھائی جان نے پوچھا ۔

"ہمیں تو بس اتنا ہی معلوم ہے کہ اسکے جسم کے تین حصّے ہوتے ہیں۔ آپکو اسکے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوں گی ۔ آپ ہمیں بتائیں"۔

ہاں ضرور مگر پہلے تم اسے آزاد کر دو"۔ بھائی جان نے کہا تو بچّوں نے تتلی کو چھوڑ دیا۔ "دیکھو اسکے سر پر دو آنکھیں تو صاف نظر آرہی تھیں ۔۔۔۔ ان کو مُرکّب آنکھیں کہتے ہیں۔ اسکے علاوہ تین چھوٹی سادہ آنکھیں بھی ہوتی ہیں" ۔

"ارے یہ تو بڑی عجیب بات ہے ! دو طرح کی آنکھیں ۔ کوئی چھوٹی، کوئی بڑی"۔ عثمان نے کہا ۔

"اکثر کیڑوں میں آنکھیں اسی طرح کی ہوتی ہیں ۔ مرکّب آنکھیں ہزاروں ننھی منّھی آنکھوں سے مِل کر بنتی ہیں ، جو روشنی کو محسوس کرتی ہیں ۔ وہ حرکت کو بھی محسوس کرتی ہیں اور تتلی کو خطرے سے آگاہ کرتی ہیں ۔ اسکی سُونڈ بَل کھائی ہوئی ہوتی ہے، جسکی مدد سے وہ پُھولوں کا رس چوستی ہے ۔ تتلی صرف رقیق یعنی پتلی چیزوں کو کھا سکتی ہے کیونکہ اسکے دانت نہیں ہوتے ۔ وہ ٹھوس غذا نہیں کھا سکتی "۔

"ہا! بیچاری! نہ چاول کھا سکتی ہے نہ گوشت ۔۔۔ نہ بسکٹ نہ ڈبل روٹی!" عمران نے کہا ۔

"اور اسکے حاسّے لَمس اور بُو کو محسوس کر سکتے ہیں"۔ بھائی جان نے بتایا۔

"تتلیاں انڈوں کے ذریعے افزائش نسل کرتی ہیں ۔ بے

شمار انڈے دیتی ہیں ۔ مگر ان میں سے محض چند ایک ہی مکمل تتلی بن پاتے ہیں ۔ اگر سب انڈوں سے تتلیاں نکل آئیں تو معلوم ہے کہ انکی تعداد کیا ہو گی؟"

"سو ۔۔۔ دو سو" عثمان نے اندازاً کہا ۔ "نہیں۔ ہر موسم میں تقریباً تیس لاکھ تتلیاں" بھائی جان نے بتایا تو عمران اور عثمان بہت حیران ہوئے ۔

"انڈے میں سے تتلی کیسے نکلتی ہے؟" عثمان نے پوچھا۔
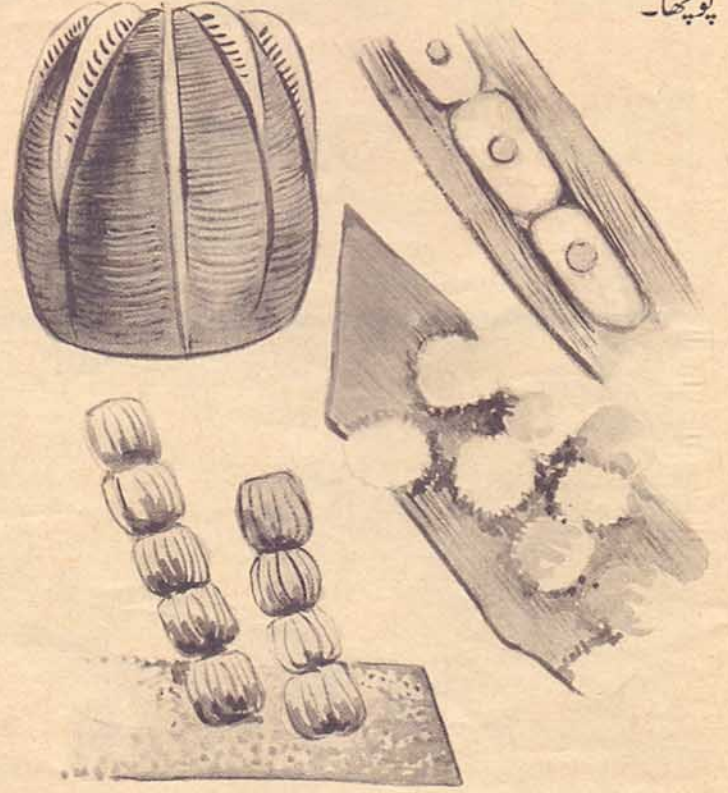
انڈے میں پہلے کچھ تبدیلیاں آتی ہیں اور اُسکے اندر لاروا بنتا ہے۔ لاروا کو "کیٹر پلر" کہتے ہیں ۔ لاروا خوب پتے کھاتا ہے اور تیزی سے حرکت کرتا ہے ۔ اسکے بعد یہ ایک اور رُوپ بدلتا ہے، جسے پیوپا یا Chrysalis کہتے ہیں پیوپا بالکل بے حِس و حرکت پڑا رہتا ہے ۔ اور پھر اُس سے تتلی بن جاتی ہے ۔ اسطرح تتلی کی زندگی کے چار دور یا مرحلے ہیں : انڈا ، لاروا ، پیوپا اور تتلی" بھائی جان نے سمجھایا یہ چاروں مرحلے آپ یاد کر لیں ۔ تتلیوں کو اقسام ، موسم اور جگہ کے لحاظ سے اِن چاروں مراحل کے لیے الگ الگ عرصہ درکار ہوتا ہے ۔ کسی جگہ صرف اٹھارہ دن میں انڈے سے تتلی نکل آتی ہے اور کہیں کئی کئی مہینے بلکہ پورا سال بھی لگ جاتا ہے"۔

"اسکے انڈے کتنے بڑے ہوتے ہیں؟ مُرغی کے انڈے تو چھوٹے ہی ہونگے؟" عمران نے پوچھا ۔

اس کے انڈے بہت چھوٹے ہوتے ہیں، اس لیئے ان کا خوردبین کے ذریعے تفصیلی مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔ انڈے مختلف سائزوں کے ہوتے ہیں انکا رنگ ، جسامت اور تراش بھی مختلف ہوتی ہے ۔ بعض انڈے لمبوترے ہوتے ہیں اور ان کا رنگ پیلا یا نارنجی ہوتا ہے ایک اور تتلی کے انڈے گول اور سبز رنگ کے ہوتے ہیں ۔ انکی سطح ناہموار ہوتی ہے اور اس پر لمبائی اور چوڑائی دونوں رُخوں پر باریک باریک لائنیں نظر آتی ہیں ۔ کچھ انڈے گول اور چپٹے ہوتے ہیں ۔ ان کے بیچ میں ایک سیاہ دھبہ نظر آتا ہے ۔ کچھ انڈے چوکور سے ہوتے ہیں اور بعض لمبے اور "ٹی کوزی" کی سی شکل کے ۔

"انڈے کے اندر بہت سی تبدیلیاں ہوتی ہیں ، جس کے بعد لاروا مکمل ہوتا ہے ۔ لاروا انڈے کے خول میں ایک ایک کر کے باہر آتا ہے ، اور مزے کی بات یہ ہے کہ خول سے باہر آنے کے بعد وہ خول کو کھا جاتا ہے ۔ اِس خول میں چند ایسے مادّے ہوتے ہیں جو لاروے کے لئے ضروری اور مُفید ہوتے ہیں ۔

لاروا چار یا پانچ مرتبہ اپنی کھال بھی تبدیل کرتا ہے ۔ اور پھر پیوپا کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ پیوپا کسی پتّے سے چمٹ کر بیٹھ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس میں ایسی تبدیلیاں آتی ہیں کہ اسکی کھال کے اندر تتلی بن جاتی ہے ۔ پھر یہ کھال درمیان سے پھٹ جاتی ہے اور ایک ننھّی سی تتلی اُس کھال سے باہر نکل آتی ہے ۔ شروع میں اس تتلی کے پر بہت چھوٹے اور سُکڑے ہوئے ہوتے ہیں ۔ یہ تتلی کسی درخت کی شاخ یا ڈنٹھل سے لٹک جاتی ہے ۔ اسکے پَر پھیلے ہوتے ہیں۔جُوں جُوں ہوا اسکے جسم میں بھر جاتی ہے ، اسکے پَر بڑے اور خُشک ہو جاتے ہیں ۔ اورجب یہ پَر اس لائق ہو جاتے ہیں کہ تتلی اُڑ سکے تو وہ اُڑنا شروع کر دیتی ہے ۔ اب اس تتلی کو بھوک بھی لگتی ہے ۔ اس لئے وہ پھولوں کا رُخ کرتی ہے تاکہ پھولوں کے رس سے اپنا پیٹ بھر سکے"۔

"تو یہ تھی کہانی ۔۔۔۔ تتلی کی" عمران نے کہا۔
آپ لوگوں کی سمجھ میں آگئی نا؟" بھائی جان نے پوچھا تو بچّوں نے مُسکرا کر کہا "بالکل آگئی"۔

شمائلہ برلاس ، ڈیرہ اسماعیل خان (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

خُرم جمال چیمہ ، سرگودھا (دوسرا انعام 90 روپے کی کتابیں)

سلمان محفُوظ منہاس ، لاہور (تیسرا انعام 80 روپے کی کتابیں)

فوزیہ برلاس ، ڈیرہ اسماعیل خان (چوتھا انعام 70 روپے کی کتابیں)

عماد حُسین بھلّی ، پکّا گڑھ سیالکوٹ (پانچواں انعام 60 روپے کی کتابیں)

عبدالمبین صدیقی ، پشاور (چھٹا انعام 50 روپے کی کتابیں)

اس سائز میں تصویر بناؤ
5 1/2 × 4 3/4

مدیحہ جمیل ، گُل بہار 2 پشاور (ساتواں انعام 40 روپے کی کتابیں)

سعدیہ شاہانہ عباس ، سرگودھا (آٹھواں انعام 30 روپے کی کتابیں)

صائمہ اصغر ، قصور (نواں انعام 20 روپے کی کتابیں)

روبینہ اشرف ، بہاول پور (دسواں انعام 10 روپے کی کتابیں)

اِن ہونہار مُصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں :

بشریٰ مسعود ، جہلم۔ذیشان اقبال ، گوجرانوالہ ۔ ہاجرہ باجوہ ، اسلامیہ پارک لاہور ۔ شاہد خان جدون ، بگڑہ ضلع ایبٹ آباد ۔ صفیہ صابر ، گوٹھ ماچھی ضلع رحیم یارخان ۔ عمران خان ، گڈو بیراج کشمور ۔ ماجد خان جدون ، بگرہ ضلع ایبٹ آباد ۔ راشدہ سعید ، میرپور آزاد کشمیر ۔ سیّد عابد علی ، کراچی ۔ منان عظیم (نامعلوم) ۔ زاہد خان وردگ ، گڈو بیراج ۔ آسیہ حسین ، لیاقت پور ۔ قیصر محمود ثانی ، گوجرانوالہ ۔ شاہ ارم نیاز ، ڈیرہ اسماعیل خان ۔ میاں مظہر اقبال آرائیں ، عثمان آباد ملتان ۔ شاہد غازی ، گڈو بیراج ۔ شکیل احمد خان ، پشاور شہر ۔ شازیہ سلیمان ، انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور ۔ خضرحیات ، کاکڑہ ٹاؤن ، میر پور ۔ نورین تاج سعودی عرب ۔ سحر خالد ، چک نمبر 113 جنوبی سرگودھا ۔ شہلا ریاض ، سانده کلاں لاہور ۔ نُصرت پروین ، گڈو بیراج ۔ فائزہ اقبال ، گوجرانوالہ ۔ شائستہ سیّد ، چک نمبر 113 جنوبی سرگودھا ۔ محمد مظہر اعوان ، گڈو بیراج ۔ عمر سلیمان ، باغبان پورہ لاہور ۔ نازش حیات ، ڈیرہ اسماعیل خان ۔ نعیم احمد ، راولپنڈی ۔ سعدیہ خالد ، لاہور ۔

آپ اِن موضُوعات میں سے جِس موضُوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں :

جُون : بِلّی اور چُوہا | (آخری تاریخ 10 مئی) | جولائی : مور اور مورنی

اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر سے تصدیق کرانی ضروری ہے ۔

میں نے بچوں کے تمام رسالے پڑھے ہیں مگر تعلیم و تربیت کا جواب ہی نہیں ۔ اس ماہ کا ٹائیٹل پسند آیا ۔ اس کے علاوہ سنہری انگوٹھی ، چچا بھلکڑ ، برکتوں والا مہینا اور نظم پھول بھی پسند آئی ۔ پراسرار نقاب پوش ہٹ جاری ہے ۔ اس کے علاوہ کامک بھی اچھی ہے ۔

(شہباز لودھی علی پور ضلع مظفر گڑھ)

● اپریل کا شمارہ پڑھ کر دل خوش ہوگیا ۔ کہانیوں میں چچا بھلکڑ ، سچا موتی ، سنہری انگوٹھی اور گلہری کی آزادی بہت اچھی لگیں ۔

(شہلا منیر پشاور صدر)

● اپریل کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی ۔ سنہری انگوٹھی ، توبہ، چچا بھلکڑ بہت مزیدار کہانیاں ہیں ۔ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے ۔ ہماری ننھی منی دعائیں ہمیشہ تعلیم و تربیت کے ساتھ رہیں گی ۔

(لُبنیٰ رؤف سیالکوٹ)

● اپریل کا شمارہ پڑھا تو بہت مزہ آیا ۔ سرورق خوب صورت تھا ۔ کہانیوں میں گلہری کی آزادی ، توبہ اور عجیب کہانی پسند آئیں ۔ زمین پر زندگی کی ابتدا بھی اچھا مضمون تھا ۔ اور سالنامہ کا سُن کر تو بہت خوشی ہوئی ۔

(ہیبت خاں ۔ زام پبلک سکول ٹانک)

● مجھے اس ماہ کے تعلیم و تربیت میں گلہری کی آزادی ، سنہری انگوٹھی ، نو بہن بھائیوں کا مزہ اور پراسرار نقاب پوش کہانیاں بہت پسند آئیں ۔

اللہ تعالیٰ پاکستان کے ہر بچے کو تعلیم و تربیت پڑھنے کا شوق عطا فرمائے ۔ آمین ۔

(امتیاز حسین اشرف ۔ بھلوال سرگودھا)

● اس ماہ کا تعلیم و تربیت پہلی تاریخ ہی کو خرید لیا ۔ اُمید سے بڑھ کر اچھا پایا ۔ یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ اگلے مہینے کا رسالہ سالنامہ ہوگا ۔ گلہری کی آزادی اتنی اچھی نہ تھی جب کہ سچا موتی اچھی کہانی تھی ۔ سنہری انگوٹھی بھی اچھی تھی ۔ چھاپہ خانہ کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا ۔ توبہ سبق آموز کہانی تھی ۔ چچا بھلکڑ کی کہانی کا وہ اختتام نہ ہوا جو ہونا چاہیے تھا ۔ عجیب کہانی میں اوہنری نے سواری دیر سے ملنے پر بھر پور طنز کی ہے ۔ اے حمید صاحب کی سیریل اچھی جا رہی ہے ۔ میرے خیال میں اسے زیادہ صفحوں میں پھیلایا جائے ۔ قرآنی کہانی پڑھ کر ایمان تازہ ہوا اور آیئے دوست بنائیں میں اپنی تصویر دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا ۔

(مسرور احمد اسلام آباد)

● اس ماہ کا سرورق خوبصورت نہ تھا ۔ بہت بُرا لگا ، لیکن اس کا بدلہ کہانیوں نے چکادیا ۔ چچا بھلکڑ ، سنہری انگوٹھی اور نو بہن بھائیوں کا مزہ بہترین کہانیاں ہیں ۔ چھاپا خانہ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا ۔

(مظفر اقبال حاجی والہ گجرات)

● اس شمارے کی تقریباً تمام کہانیاں بہت پسند آئیں ۔ خاص طور پر جاسوس کی چیخ بہت ہی اچھی لگی ۔ میری طرف سے آپ اے حمید کو مبارک باد دیجئے ۔ اور کیا آپ نے آپ بھی پوچھیے کا سلسلہ ختم کر دیا ہے ؟ ایسا ہر گز نہ کریں ۔ کیونکہ اس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے ۔

(نجمہ غلام حسین گوجرانوالہ)

● اس مرتبہ بھی تمام کہانیاں اچھی تھیں ۔ خاص طور پر سنہری انگوٹھی ، توبہ اور نو بہن بھائیوں کا مزہ ۔ پراسرار نقاب پوش اس مرتبہ بھی نمبر لے گیا ۔ سرورق اتنا اچھا نہ تھا ۔

(محمد نواز خان ۔ فیصل آباد)

● اپریل کے شمارے کا سرورق متاثر نہیں کر سکا ۔ پراسرار نقاب پوش اچھا جا رہا ہے ۔ کہانیوں میں سنہری انگوٹھی ، بزدل ، مکار اور بہادر اور سچا موتی پسند آئیں ۔ زمین پر زندگی کی ابتدا ، مری اور چھاپہ خانہ بھی اچھے معلوماتی مضامین تھے ۔ لطیفے اچھے تھے ۔

(فقیہہ رضوی علامہ اقبال ٹاؤن ، لاہور)

● اپریل کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا ۔ کہانیوں میں گلہری کی آزادی ، سچا موتی ، سنہری انگوٹھی بہت پسند آئیں ۔ پراسرار نقاب پوش بہت اچھا جا رہا ہے ۔

(عابد طور ٹاؤن شپ لاہور)

سرورق کوئی خاص نہ تھا ۔ البتہ اندر سے رسالہ اتنا اچھا تھا کہ تعریف کے لئے الفاظ نہیں مل رہے ۔

(ثانیہ عروج راولپنڈی)

● اس دفعہ سرورق اچھا نہ تھا ۔ لیکن گلہری کی آزادی ، سچا موتی ، سنہری انگوٹھی اور توبہ کہانیاں رسالے کی رونق تھیں ۔ داؤدی علمی معما ختم کر کے آپ نے اچھا کیا ۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ مئی میں رسالے کا سالنامہ آرہا ہے ۔
(سرفراز قمر جام پور ضلع راجن پور)

● یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اگلا شمارہ سالنامہ ہوگا ۔ آپ نے داؤدی علمی معما ختم کر کے بہت ہی اچھا کیا ۔ سچا موتی ، سنہری انگوٹھی ، توبہ ، بزدل مکّار اور بہادر اور ٹیپو سلطان بہت اچھی کہانیاں تھیں ۔ پراسرار نقاب پوش اس بار بھی سبقت لے گیا ۔ لطائف بھی اچھے تھے ۔ چچا بھلکڑ بہت مزاحیہ کہانی ہے ۔ (فاروق احمد پیرزادہ پاکپتن شریف)

● کہانیوں میں سچا موتی ، چچا بھلکڑ ، سنہری انگوٹھی اور عجیب کہانی پسند آئیں ۔ نقاب پوش ناول بہت اچھا جا رہا ہے ۔ (نذیر احمد، نیو شالیمار ٹاؤن لاہور)

● اس دفعہ اپریل کا شمارہ حاصل کرنے کی لئے بہت زیادہ چکر لگانے پڑے لیکن حاصل کر کے ہی رہا ۔ اس شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں ۔ آپ نے علمی معما ختم کر کے بہت ہی اچھا کیا ۔ (محمد اسلم چک نمبر 111/P نمبر بی رحیم یار خاں)

● اس دفعہ کا تعلیم و تربیت بہت ہی اچھا تھا ، خاص طور پر گلہری کی آزادی ، سچا موتی ، سنہری انگوٹھی ، چچا بھلکڑ ، پراسرار نقاب پوش اور کامک کا تو جواب ہی نہیں ۔

آپ نے داؤدی علمی معما ختم کر دیا ۔ بہت خوشی ہوئی ۔ اب سوال جواب آئیں گے ۔ جو نسبتاً آسان ہوں گے ۔ اور جب خاص نمبر کا سُنا تو یقین جانیے بے انتہا خوشی ہوئی ۔
(کامران حمید وحدت کالونی لاہور)

● اپریل کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا ۔ کہانیوں میں سچا موتی ، چچا بھلکڑ ، اور بزدل ، مکّار اور بہادر خاص طور پر پسند آئیں ۔ پرسرار نقاب پوش کی بات ہی اور ہے ۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ داؤدی علمی معما سلسلہ ختم کیا جا رہا ہے ۔ باقی سب سلسلے اچھے ہیں ۔ (سمیعہ کنول ہاشمی ملتان)

● مجھے سچا موتی ، سنہری انگوٹھی ، توبہ ، چچا بھلکڑ ، عجیب کہانی ، کہانیاں پسند آئیں ۔ کیا آپ نے "آپ بھی پوچھیے" بند کر دیا ہے ؟ پر اسرار نقاب پوش ایک مرتبہ پھر بازی لے گیا ۔ (عبدالسلام گوندلانوالہ گوجرانوالہ)

○ اپریل کا رسالہ بہت دلچسپ تھا ۔ خاص طور پر سرورق ۔ عجیب کہانی ، چچا بھلکڑ ، سنہری انگوٹھی ، کہانیاں بے حد پسند آئیں ۔ پراسرار نقاب پوش تو بہت خوب جا رہا ہے ۔ (نذیر احمد سعود آباد ملیر کراچی)

● اپریل کا چمکتا دمکتا ستارہ تعلیم و تربیت آسمان سے اُترتا ہوا معلوم ہوا ۔ سرورق اچھا اور خوبصورت تھا ، سنہری انگوٹھی ، توبہ ، چچا بھلکڑ اور نو بہن بھائیوں کا مزہ بہترین کہانیاں تھیں ۔ پراسرار نقاب پوش بہت دلچسپ ہوتا جارہا ہے ۔ نعت ، سلام اور نظم پھول بہت خوبصورت لگیں ۔ لطیفوں میں سے کچھ لطائف پسند آئے ۔ باقی پُرانے تھے ۔
(نویدہ ظفر اسلام آباد)

● اپریل کا شمارہ بہت اچھا لگا ۔ سرورق بھی اچھا تھا ۔ گلہری کی آزادی ، سچا موتی ، سنہری انگوٹھی بہت اچھی کہانیاں تھیں ۔ پراسرار نقاب پوش بہت اچھا جا رہا ہے ۔ میری بھی خواہش ہے کہ آپ لڑکیوں کے لئے کھانے پکانے کی ترکیبیں شائع کیا کریں ۔ (عائشہ ہمایوں فیروز پور روڈ لاہور)

● اپریل کے شمارے کی تمام کہانیاں معیاری تھیں ، مگر سنہری انگوٹھی ، سچا موتی اور بزدل ، مکّار اور بہادر بہت پسند آئیں ۔ میں فیروز سنز کی کتابیں "سو بڑے آدمی" اور "ایجادوں کی کہانیاں" منگوانا چاہتا ہوں ۔ آپ بتائیں کہ کس طرح یہ کتابیں حاصل کر سکتا ہوں؟ (اکبر علی پنوں عاقل ضلع سکھر)
مینجر فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۔ ٦٠ شاہراہ قائد اعظم لاہور" کو خط لکھیے ۔

● چاند کی طرح پیارا ، ستاروں کی طرح روشن اور سورج کی طرح چمکتا دمکتا اپریل کا تعلیم و تربیت ملا ۔ بے حد پسند آیا ۔ سب سے بہترین کہانیاں سنہری انگوٹھی اور سچا موتی تھیں ۔ برکتوں والا مہینا اور معصوم اونٹنی کا قتل پڑھ کر ایمان تازہ ہوگیا ۔ مجموعی طور پر رسالہ زبردست تھا ۔ (مختار علی چیمبر لین روڈ لاہور)

● اس مرتبہ گلہری کی آزادی ، سنہری انگوٹھی ، چچا بھلکڑ ، کہانیاں بہت پسند آئیں ۔ پرسرار نقاب پوش بھی بہت پسند آیا ۔ آپ کو چاہیے کہ ایک ماہ میں دو رسالے نکالیں یا اس کے صفحات بڑھا دیں ۔ (عاقب ۔ لاہور)

اسلام آباد

محمد صابر اختر

اسلام آباد پاکستان کا دارالحکومت اور دُنیا کا جدید ترین شہر ہے ۔ پاکستان جب وجود میں آیا تو اس وقت کراچی کو دارالحکومت بنایا گیا تھا ۔ لیکن فروری 1959 میں صدر ایّوب خاں کے قائم کردہ کمیشن نے دارالحکومت کے لیے موجودہ اسلام آباد کی جگہ کا انتخاب کیا ۔ 1963 میں اس شہر میں زندگی رواں دواں ہوگئی تو حکومت کے دفاتر یہاں منتقل ہوگئے ۔

اسلام آباد راولپنڈی سے آٹھ میل شمال کی طرف سطح مرتفع پوٹھوار پر واقع ہے ۔ چونکہ یہ شہر سطح سمندر سے تقریباً 2000 فٹ کی بلندی پر مری کے دامن اور مارگلہ کے پہاڑی سلسلے میں واقع ہے اس لیے یہاں کا موسم نہایت خوشگوار ہے ۔ سردیوں میں یہاں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 16.7C° اور کم سے کم 3.4C° اور گرمیوں میں اوسط درجہ حرارت زیادہ سے زیادہ 34.2C° اور کم سے کم 24.2C° ہوتا ہے ۔ 1981 کی مردم شماری کے مطابق اسلام آباد کی آبادی 3 لاکھ پچاس ہزار افراد پر مشتمل ہے ۔

اسلام آباد کا نقشہ "ڈاکسیاڈس پونٹی" اور "ایورڈ ڈیورل سٹون" نے تیّار کیا تھا ۔ اسلام آباد کو دارالحکومت قرار دینے کے بعد کیپیٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (C.D.A) قائم کی گئی ۔ شہر کے ترقیاتی کاموں کی نگرانی اسی ادارے کے ذمّے تھی ۔ اس ادارے نے اسلام آباد کو اِس قدر خوبصورت بنایا کہ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری جنرل "اوتھانٹ" نے اسے ایشیا کا برازیلیا کہا (برازیلیا جنوبی امریکا کے ایک ملک برازیل کا دارالحکومت ہے)

1981 تک اسلام آباد صوبہ پنجاب کا حصّہ تھا ۔ لیکن جب اِس کی حد بندی کی گئی تو اس علاقے کو وفاق کے سُپرد کر دیا گیا ۔ اس شہر کا رقبہ 351 مربع میل ہے اور یہ مختلف سیکٹروں میں بٹا ہوا ہے ۔

انتظامی سیکٹر : انتظامی سیکٹر سیکرٹریٹ بلاک ، وزارتِ خارجہ کی عمارت ، سٹیٹ بنک ، قومی اسمبلی ، ایوانِ صدر اور سپریم کورٹ کی عمارات پر مشتمل ہے ۔

سیکرٹریٹ بلاک میں وفاقی حکومت کے تمام اُمور نپٹائے جاتے ہیں ۔ جبکہ وزارتِ خارجہ کی عمارت میں بیرونی ممالک کے سفارتخانے اور دفاتر ہیں ۔ سٹیٹ بنک مُلکی مالیات کا حساب کتاب رکھتا ہے ۔ قومی اسمبلی کی عمارت میں منتخب قومی اسمبلی اور سینٹ کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں ۔ ایوانِ صدر صدرِ پاکستان کی رہائیش گاہ ہے ۔

ثقافتی سیکٹر : اِس سیکٹر میں نیشنل لائبریری کے علاوہ نیشنل میوزیم (قومی عجائب گھر)، مسلح افواج کا میوزیم ، نیشنل آرٹس کونسل اور براڈکاسٹنگ کارپوریشن ہاؤس کی عمارتیں شامل

ہیں ۔ براڈکاسٹنگ کارپوریشن ہاؤس کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے ۔
صنعتی سیکٹر : اِس سکیٹر میں کپڑے کی کھڈیاں ، ربڑ بنانے کے کارخانے ، پلاسٹک کی فیکٹریاں ، اور ریلوں کے ڈبّے بنانے کی صنعتیں قابلِ ذکر ہیں ۔
رہائشی سیکٹر : اِس سیکٹر میں وفاقی وزیروں اور دوسرے سرکاری ملازمین کے بنگلے اور مکانات ہیں ۔
اسلام آباد کو خوبصورت بنانے کے لیے اِس میں بہت سے پارک بنائے گئے ہیں ، جن میں نیشنل پارک سرِفہرست ہے ۔ نیشنل پارک کے علاوہ بہار اکھو پارک اور ارجنٹینا پارک بھی بہت شاندار پارک ہیں ۔ روز اینڈ جیسمین گارڈن میں چنبیلی کے علاوہ گلابوں کی سینکڑوں اقسام کے رنگ برنگ پھول اگائے گئے ہیں ۔
راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان شکرپڑیاں بھی خوبصورت

مقام ہے ۔ یہاں مختلف ممالک کے سربراہوں کے لگائے ہوئے بے شمار درخت موجود ہیں ۔ رات کو شکرپڑیاں سے اسلام آباد کی جِھلملاتی روشنیاں بہت خُوش نُما نظارہ پیش کرتی ہیں ۔
اسلام آباد کلب اور اسلام آباد سپورٹس اینڈ کلچرل کمپلیکس بھی قابل دید مقامات ہیں ۔ پرائم منسٹر ہاؤس بھی جو ابھی تکمیل کے مراحل سے گزر رہا ہے ، اپنی مثال آپ ہے ۔ اسلام آباد کے شہریوں کو پینے کے لیے راول جھیل کا پانی مہیّا کیا جاتا ہے ۔
اسلام آباد کا ایک نمایاں پہلو الفیصل مسجد ہے ۔ اس مسجد کو دُنیا کی سب سے بڑی مسجد ہونے کا اعزاز حاصل ہے ۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد سعودی عرب کے شاہ خالد نے 1976 میں رکھا تھا ۔ تعمیر کے تمام اخراجات بھی سعودی حکومت نے برداشت کیے ہیں ۔
اسلام آباد میں تین یونیورسٹیاں ہیں : قائداعظم یونیورسٹی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور اسلامی یونیورسٹی ۔ ان یُونیورسٹیوں کے علاوہ متعدد دیگر سائنسی اور فنی ادارے مثلاً نیوکلیر انسٹی ٹیوٹ ، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، گورنمنٹ پولی ٹکنیک انسٹی ٹیوٹ ، ہائڈرو کاربن انسٹی ٹیوٹ اور ثقافتی انسٹی ٹیوٹ وغیرہ شامل ہیں ۔
دُنیا کا یہ جدید ترین اور خوبصورت شہر اب صرف پاکستان کا دارالحکومت ہی نہیں، بین الاقوامی کانفرنسوں کا شہر بھی ہے ۔
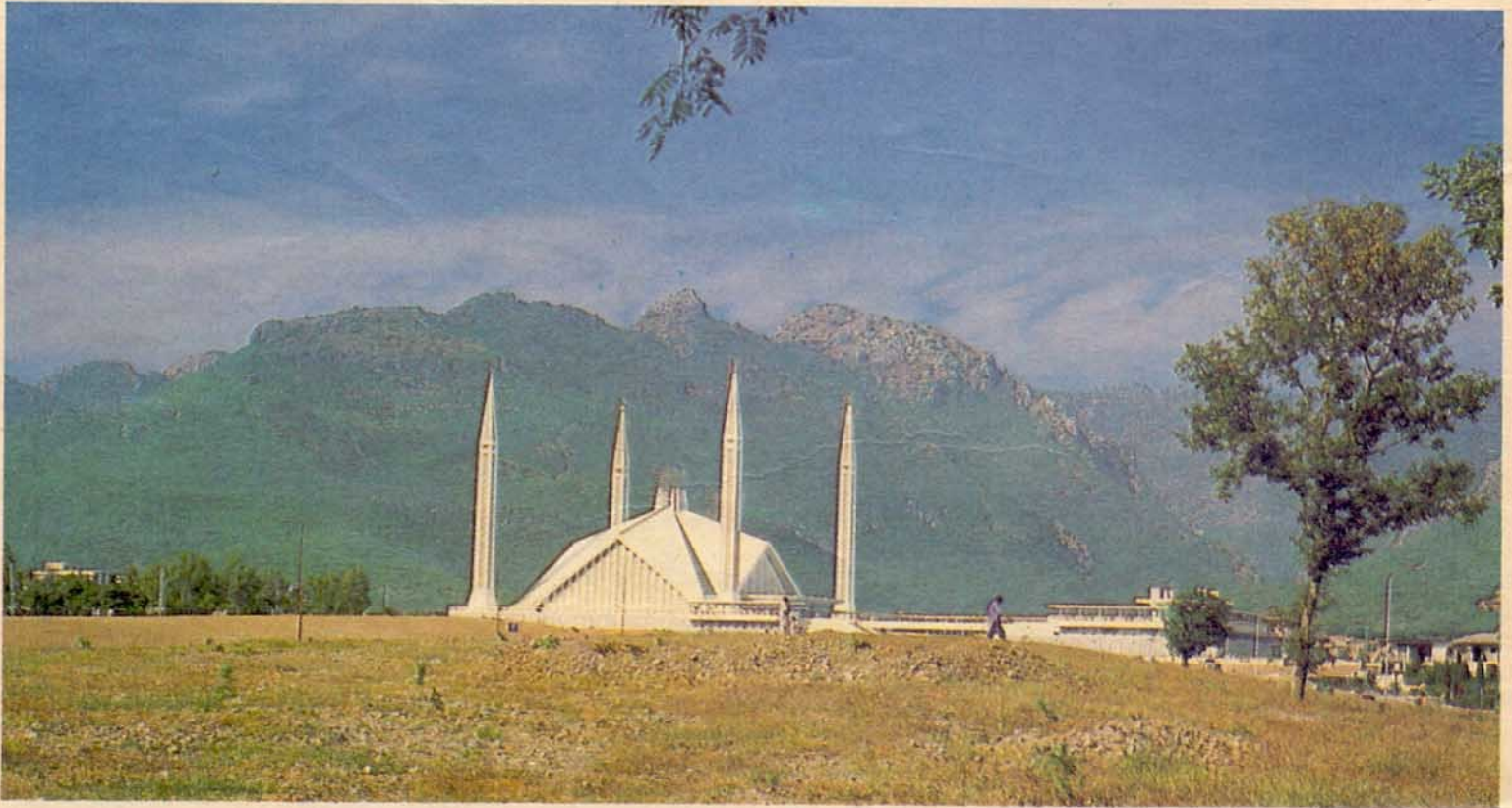
آئیے دوست بنائیں

سید مشرف لطیف 16 سال
کرکٹ ۔ مطالعہ
کوٹھی نمبر 3 فیصل کالونی
بہاولپور

عارف حسین 14 سال
کرکٹ ، ہاکی
محمد طفیل اینڈ برادرز
مین بازار صادق آباد

محمد اقبال نور 14 سال
سکے جمع کرنا
مکان نمبر 43-S-16 محلہ عالمگیر
پارک مین نزد شالیمار روڈ نزد نولکھوٹ لاہور

راجہ راحیل اختر کیانی 12 سال
مطالعہ ۔ کرکٹ
کیانی ہاؤس گلی نمبر 9
عزیز آباد ۔ راولپنڈی

وود حسن ڈار 14 سال
کرکٹ
A/25 سیٹلائٹ ٹاؤن
گوجرانوالہ

محمود عبداللہ انصاری 13 سال
کرکٹ
چوہدری عبدالغفور دانی روڈ
شاہجمال ضلع مظفر گڑھ

کاشف عارف 10 سال
تیراکی
گورنمنٹ کالج برائے خواتین
بہاول پور

حافظ عبدالرحیم 14 سال
کرکٹ
46/282- اے مدینہ کالونی
چاہ میراں لاہور 39

محمد رزاق 16 سال
کرکٹ
محلہ محمد نگر
ریلوے کالونی وزیر آباد

اقبال حسین شوکت 16 سال
کتابیں جمع کرنا
معرفت بشیر میڈیکل سٹور ریلوے
روڈ شجاع آباد ۔ ملتان

عمر منیر 13 سال
پرانے سکے جمع کرنا ۔ کرکٹ
مکان نمبر 17/19 تا چوہڑ سٹریٹ
میانہ پورہ دارہ ارائیاں سیالکوٹ

سجاد شبیر 16 سال
کتب بینی ۔ خدمت خلق
بالمقابل پاکستان آئل ملز
علی ٹاؤن جھنگ شہر

سید مبشر محسن نقوی 14 سال
بمقام چمبر ڈاکخانہ سرائے عالمگیر
باغبانی ۔ سیر ۔ کرکٹ
تحصیل کھاریاں ضلع گجرات

وسیم عباس 14 سال
بیڈمنٹن ۔ کرکٹ ۔ مطالعہ
محمد انور برتن سٹور قبولہ شریف
ضلع ساہیوال

شیخ محمد صدیق 14 سال
فٹ بال ۔ تیراکی
ایم اشرف گلاب بن کوٹلی لوہاراں
مشرقی ۔ ضلع سیالکوٹ

زاہد یوسف 15 سال
فٹ بال ۔ جوڈو کراٹے
وارڈ نمبر 7
محلہ مدن شاہ جھنگ شہر

طارق نعیم شہزاد 16 سال
ٹکٹ ۔ سکے ۔ قلمی ۔ دوستی
طارق نعیم شہزاد علی
چیک پوسٹ کوڈ نمبر 50221

محمد گلشن حیات 14 سال
کرکٹ
محلہ رحمان پورہ ظفر آباد
ضلع سرگودھا

محمد اسلم شاد 12 سال
ٹکٹ جمع کرنا
مدینہ ٹاؤن 103.Y.19
فیصل آباد

ایم رمضان علی شاہ 13 سال
قلمی دوستی ۔ سیر و سیاحت
گلشن کالونی پوسٹ کوڈ نمبر
35202 جھنگ صدر

ملک عزیز الرحمٰن 17 سال
ہاکی ۔ جوڈو کراٹے
گلی ملازم حسین شاہ ۔
وانڈھی ہاشم شاہ میانوالی

سید امجد علی شاہ 10 سال
ڈاک ٹکٹ اکٹھی کرنا
چک چھٹہ
حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ

محمد ہارون 15 سال
کرکٹ
8/1396 پیپلز کالونی
فیصل آباد

آئیے دوست بنائیں
مئی : 1989

قلمی دوستی کی اس محفل میں شریک ہونے کے لیے
یہ کوپن پُر کرنا اور تصویر بھیجنا ضروری ہے ۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں ۔)

نام ________ عمر ________
مشاغل ________
پتا ________

اختر رسول 12 سال
ٹکٹیں اور سکے جمع کرنا
محلہ چمن پارک باغبانپورہ دکان
بالمقابل اسحاق جنرل سٹور لاہور ۹

محمد عمران غوری 13 سال
روتے ہوؤں کو ہنسانا
مکان نمبر 3/240 منشی محلہ
منڈی بہاؤالدین

کاشف سلیم سال
سوئمنگ، ٹکٹ جمع کرنا
P.E.C.H.S. بلاک :- 2 - 190/B
کراچی

شاہد یار 14 سال
کرکٹ، قلمی دوستی
محلہ ونگڑی گراں والا
ڈیرہ اسماعیل خان

سید تنویر حسین 13 سال
ہاکی کھیلنا
کوٹھی نمبر 11/2 سٹلائیٹ ٹاؤن
چشتیاں

محمد شاہد سلیم 9 سال
کرکٹ
69 B اصغر مال اسکیم
راولپنڈی

کاشف کمال 11 سال
کرکٹ۔ سوئمنگ۔ ہاکی
النسیم۔ دانش آباد مکان نمبر 3/A
پشاور

اسد اقبال ملک 9 سال
ٹکٹ جمع کرنا
فرخ جیولر صرافہ بازار
گوجرخان۔

رفاقت سربلند 8 سال
کارٹون بنانا
گلی نمبر 4 مکان نمبر 3 محلہ برکت پورہ
شالا مار ٹاؤن باغبانپورہ

رئیس عبدالغنی 13 سال
کرکٹ
عزیز آٹوز۔ چوک ظاہر پیر
تحصیل خان پور ضلع رحیم یار خان

رضوان بلال 8 سال
فٹ بال کھیلنا
پوسٹ آفس بکس 868 دہران
سعودی عربیہ

حبیب اللہ 16 سال
کرکٹ۔ فوٹو گرافی
معرفت آصف فوٹو سٹوڈیو بھکر روڈ
جھنگ صدر

محمد عثمان میاں 16 سال
ٹکٹیں جمع کرنا
50۔ راوی پارک، راوی روڈ
لاہور

سید محمد علی عباس شیرازی 12 سال
کرکٹ کھیلنا
135 کینال کالونی
بہاول پور

مرزا عمر دراز قیصر 16 سال
میوزک۔ قلمی دوستی
خان بابا کالونی نزد سلیم ہوٹل
مکان نمبر 138 بہاول نگر

سلطان نصیر قاسم 10 سال
کرکٹ
پیرزمانی سٹریٹ رسول پارک
ملتان روڈ۔ لاہور

ھادی حسین 11 سال
قلمی دوستی
C/55 مدینہ بلاک اعوان ٹاؤن
ملتان روڈ لاہور

محمد لطیف اللہ 18 سال
ڈرائنگ
AI-64 ٹاؤن شپ
لاہور

محمد صابر 13 سال
ہاکی کھیلنا
حاجی محمد یٰسین نیوز ایجنٹ
صدر بازار ٹوبہ ٹیک سنگھ

سہیل بشیر ذاکر 14 سال
قلمی دوستی۔ مصوری
گلی نمبر 3 مکان نمبر 3 طارق کالونی
شہباز خان روڈ قصور

محمد نصیب اللہ خان 16 سال
قلمی دوستی
بمقام ڈاک خانہ دھوریہ
تحصیل کھاریاں ضلع گجرات

امیر محمد کارا 12 سال
کرکٹ کھیلنا
فلیٹ نمبر B/3 ایزکون اپارٹمنٹ
M 692 جمشید روڈ فاطمہ جناح کالونی کراچی

ناصر سعید 15 سال
کرکٹ کھیلنا
آر۔ 589 بلاک۔ 20
فیڈرل بی ایریا کراچی 38

محمد عرفان 13 سال
کرکٹ
96.0 احاطہ تارا سنگ
پشاور کینٹ

کاظم نذیر 14 سال
ٹکٹ جمع کرنا
علی زچہ بچہ کیئرنگ سینٹر
نزدیک دل ہسپتال

محمد آصف اقبال 12 سال
ٹکٹ جمع کرنا
13/4 کنال بینک روڈ گلبرگ II
راجہ اسٹیٹ لاہور

فہد اسلام 9 سال
کرکٹ
54/C/6 P.E.C.H.S.
کراچی - 29

کِرن

رابعہ رحمٰن

حیدر صاحب کاروبار کے سلسلے میں انگلینڈ گئے تو وہاں انہیں مسٹر سٹیفن جیسا بہترین دوست مِلا۔ دونوں میں اتنی پکی دوستی ہوگئی کہ مسٹر سٹیفن نے اگلے سال پاکستان آنے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے سال مسٹر سٹیفن جب پاکستان آئے تو اُن کی دس سالہ بیٹی سِلوی بھی اُن کے ہمراہ تھی۔ حیدر صاحب اپنی بیٹی صبا کے ہمراہ مہمانوں کے استقبال کے لئے اسلام آباد ائر پورٹ پر موجود تھے ۔ سٹیفن جب ہوائی جہاز سے اُترے تو حیدر صاحب اُن سے بڑے پُرجوش انداز سے ملے۔ صبا نے بھی سِلوی کو خوش آمدید کہنے کے لئے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

جب سب گھر پہنچے تو کِرن پھولوں کا گلدستہ لئے کھڑی تھی ۔ کِرن نے آگے بڑھ کر سنہری بالوں والی انگریز گڑیا سِلوی کو گلدستہ پیش کرنا چاہا۔ مگر صَبا نے گلدستہ درمیان سے ہی پکڑ لیا اوربولی "تم اِدھر کیا کر رہی ہو کِرن؟ جاؤ جا کر کام کرو۔" کِرن کی خوبصورت آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ سِلوی نے پوچھا "صبا کیا یہ بھی ہماری دوست ہے؟" صبا نے نخوت سے جواب دیا "نہیں۔ یہ تو ہمارے گھر میں کام کرنے والی لڑکی ہے۔"

کِرن نے یہ سنا اور اندر بھاگ گئی۔

سِلوی نے صبا کے ہاتھ سے وہ گُلدستہ لے لیا اور دونوں باتیں کرتی ہوئی ڈرائینگ روم میں آگئیں جہاں حیدر صاحب اور مسٹر سٹیفن خوش گپّیوں میں مصروف تھے ۔ اتنے میں ایک عورت ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر داخل ہُوئی اور چائے بنانے لگی۔ "سِلوی، یہ کِرن کی ماں ہے" صبا نے بتایا۔ کِرن کی ماں نے چائے بنا کر سب کو پیش کی۔

چائے پینے کے سِلوی اور صَبا نے کپڑے بدلے اور باغ میں آگئیں۔ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کھیل رہی تھیں کہ سِلوی کی نظر درخت کے پیچھے کھڑی ہوئی کِرن پر پڑی۔ سِلوی نے صبا کاہاتھ چھوڑا اور کِرن کی طرف بڑھ کر کہا " آؤ کرن ہمارے ساتھ کھیلو۔"

"نہیں، نہیں۔ میں نہیں کھیلوں گی ۔ صبا بی بی مُجھے مارىں گی۔" کِرن نے ڈر کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

سِلوی نے کِرن کا بڑھ کر ہاتھ تھام لیا اور کہا "نہیں کِرن صبا تو اتنی اچّھی لڑکی ہے وہ بھلا تمہیں کیوں مارے گی؟"

اِتنے میں صبا بھی قریب آگئی اور بولی "کیا بات ہے سِلوی؟"

"کچھ نہیں صبا ۔ میں کِرن سے کہہ رہی تھی کہ ہمارے ساتھ کھیلو مگر وہ تم سے بہُت ڈرتی ہے۔"

"اس نے ضرور تم سے میری شکایت کی ہوگی" صبا ایک دم غُصّے سے بولی اور کِرن نے کو دھکّا دینا چاہا۔ جب صبا کِرن کو دھکّا دینے لگی تو سِلوی اچانک درمیان میں آگئی۔ سِلوی کو اِتنی زور سے دھکّا لگا کہ وہ پھولوں کی کیاری میں جا گِری۔ کرن نے جلدی سے سِلوی کو اُٹھایا ۔ اُس کے بازوؤں پر کچھ خراشیں آگئی تھیں۔

صبا اندر گئی تو حیدر صاحب سامنے ہی کھڑے تھے "ابُو! کِرن نے سِلوی کو پُھولوں کی کیاری میں گِرا دیا ہے۔" صبا نے ان سے شکایت کی۔ حیدر صاحب جلدی سے سِلوی کے پاس گئے اور اُس کے بازوؤں کی خراشیں ڈیٹول سے صاف کیں اور دوائی لگا دی۔ پھر وہ صَبا سے کہنے لگے "بیٹی، میں جانتا ہوں کِرن بہت سمجھدار لڑکی ہے۔ اُس نے سِلوی کو جان بوجھ کر نہیں گِرایا ہو گا۔" باپ کو کِرن کی حمایت کرتے دیکھ کر صبا

رونے والی ہوگئی اور کمرے میں چلی گئی۔ حیدر صاحب نے سِلوی کو کہا مجھے بہت افسوس ہے بیٹی کہ آپ کو تکلیف اُٹھانا پڑی ۔

کوئی بات نہیں انکل۔ بچّوں کو تو چوٹیں لگتی ہی رہتی ہیں۔ اور ویسے بھی مجھے کِرن نے نہیں گرایا۔
صَبا کِرن کو دھکّا دینے کے لئے آگے بڑھی تو میں درمیان میں آگئی اور گِر گئی"۔ سِلوی نے تمام بات بتا دی۔

حیدر صاحب بولے "بیٹی ، صبا کی یہی باتیں مجھے پریشان کرتی ہیں۔ پتا نہیں وہ کِرن کو کیوں بُرا سمجھتی ہے؟"

سِلوی حیدر انکل کو خُدا حافظ کہہ کر صبا کے کمرے میں چلی گئی۔ صبا اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ سِلوی نے خاموشی سے بتّی بُجھا دی اور آرام سے سو گئی۔

صُبح ناشتے پر کِرن اپنی امّی کے ساتھ میز پر چیزیں رکھ رہی تھی کہ سِلوی حیدر صاحب سے کہنے لگی "انکل آج ہم لوگ سیر کرنے جائیں گے اور کِرن بھی ہمارے ساتھ جائے گی"۔

"ہاں ، ہاں بیٹی ! ضرور" حیدر صاحب نے جواب دیا "میں دفتر سے گاڑی بھجوا دوں گا ۔ تم کِرن کی امی کو ساتھ لے کر چلی جانا"۔

"شکریہ، انکل" سِلوی نے کہا ۔

"نہیں ابّو۔ ہم کِرن کو ساتھ لے کر نہیں جائیں گے" صَبا نے کہا ۔ "کِرن تمہارے ساتھ سیر کرنے تھوڑی جا رہی ہے ۔ وہ تو سامان وغیرہ کا دھیان رکھنے کے لئے جا رہی ہے"۔ حیدر صاحب نے صبا کو منانے کے لئے کہا۔ صبا نے اچھا ابو کہا اور کمرے میں تیّار ہونے کے لئے چلی گئی ۔

سِلوی کمرے میں جانے کی بجائے باورچی خانے میں چلی گئی جہاں کِرن چہرا ہتھیلیوں پر رکھے کچھ سوچ رہی تھی ۔

"آنٹی، آپ کِرن کو تیّار کر دیں ۔ ہم سب سیر کرنے جائیں گے" سِلوی نے کِرن کی امّی سے کہا۔

"نہیں۔میں نہیں جاؤں گی" کِرن نے کہا۔ سِلوی نے وجہ پوچھی، تو کِرن نے کہا "میں اِس لئے نہیں جاؤں گی کیونکہ صبا بی بی مجھے پسند نہیں کرتیں"۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

کِرن کی امّی نے سِلوی سے کہا" بیٹی، تم جاؤ ۔ میں اِسے تیّار کرتی ہوں"۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سب تیّار ہو کر ٹیکسلا روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر صَبا اور سِلوی سیر کرنے لگیں تو سلوی نے کِرن کو ساتھ لے لیا ۔ کِرن نے دو تین دفعہ صَبا اور سِلوی کی گفتگو میں شامِل ہونے کی کوشش کی لیکن صبا ہر دفعہ اس کو جھاڑ پلا کر خاموش دیتی۔ سیر کرنے کے بعد جب تینوں واپس آئیں تو کِرن کی ماں گھاس کے ایک سر سبز لان میں کھانا لگا چکی تھی۔

"صبا بی بی، کھانا لے آؤں؟" کِرن کی ماں نے پوچھا۔

"ہاں، لے آؤ بھوک لگ رہی ہے"۔ صَبا نے کہا ۔

صبا اور سِلوی کھانا کھانے لگیں تو سِلوی نے کِرن سے کہا" آؤ. کِرن، تم بھی ہمارے ساتھ کھانا کھا لو"۔

"بیٹی! آپ کھائیں، یہ بعد میں کھا لے گی" کِرن کی ماں نے کہا ۔

"نہیں آنٹی۔ کِرن ہمارے ساتھ ہی کھائے گی" سِلوی

نے اصرار کیا ۔ کِرن ایک طرف چادر پر بیٹھ گئی۔ صبا نے مُنہ بسورتے ہوئے کھانا شروع کیا تو کِرن بولی "بسم اللہ تو پڑھ لو، صبا۔" صبا یہ سُن کر لال پیلی ہوگئی ۔ اُس نے نوالہ کِرن کے مُنہ پر دے مارا اور بولی "تم سمجھتی ہو کہ میں نے بسم اللہ نہیں پڑھی ۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"صبا بی بی کِرن نے آپ سے کوئی غلط بات تو نہیں کہی" کِرن کی ماں نے کہا ۔ یہ سُن کر صبا کو اور بھی غصّہ آگیا۔ وہ غصّے سے پیچھے کو مُڑی تو اُس کا پاؤں ایک گڑھے میں پڑا اور دُہرا ہوگیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گِر پڑی ۔ کِرن کی ماں نے اُس کو اُٹھایا ۔ اُس کے پاؤں میں موچ آگئی تھی ۔

جب گھر پہنچے تو درد کی وجہ سے صبا کو بُخار ہوگیا۔ کِرن صبا کے بُخار سے بہت پریشان تھی۔ وہ آدھی رات تک صبا کے کمرے میں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی رہی ۔ اُس کو نیند نہیں آ رہی تھی ۔ در اصل اُسے موٹی آنکھوں والی صبا بہت اچھی لگتی تھی ۔ مگر وہ صبا کے جتنا قریب رہنے کی کوشش کرتی، وہ اُتنا ہی اُس سے دور رہتی۔

کِرن آدھی رات کو کمبل اوڑھ کر قالین پر بیٹھ گئی اور اللہ میاں سے دُعا کرنے لگی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے ۔ کچھ دیر بعد صبا کا حلق خُشک ہوا تو اُس نے آنکھیں کھول دیں ۔ کِرن اب بھی رو رہی تھی۔اُس کا معصوم چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چُکا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے نِکلنے والی سِسکیاں اور دعائیں صبا نے بھی سُن لیں مگر آنکھیں بند کیے لیٹی رہی ۔

جب کچھ دِنوں بعد صبا تندرست ہو گئی تو سِلوی کے ابّو نے بتایا کہ ہم پرسوں جا رہے ہیں۔ یہ سُن کر صبا اور سِلوی دونوں پریشان ہوگئیں ۔ اگلی صُبح سِلوی نے صبا سے کہا "اگر میں تمہاری دوست ہونے کے ناتے تم سے ایک بات کہوں تو بُرا تو نہیں مانو گی ؟"

صبا نے مُسکرا کر کہا "نہیں۔ بالکل نہیں۔"

"دیکھو، صبا میں چلی جاؤں گی تو تم اکیلی رہ جاؤ گی۔ میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں کہ کِرن کو اپنی دوست بنا لو۔ دیکھو، اللہ تعالی نے سب کو برابر بنایا ہے۔ اگر کِرن غریب ہے تو اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دوستی کے قابل نہیں۔ وہ تو بہت پیاری لڑکی ہے ۔ تم سے بہُت پیار کرتی ہے ۔ تم نے دیکھا نہیں کہ تمہاری بیماری میں بیچاری کس طرح ساری رات جاگتی رہی؟"

سِلوی کی یہ بات سُن کر صبا کو کِرن کی آدھی رات والی سِسکیاں یاد آگئیں اور اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے ۔ اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "مگر میں اُس سے کیسے کہوں کہ وہ میری دوست بنے؟ مجھے معافی مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"تو کیا تم کِرن کو اپنی دوست بنانے کے لیے تیّار ہو؟" سِلوی نے خوشی سے کہا۔ "دوست نہیں بلکہ بہن" صُبا نے کہا "اُس رات جب میں بیمار تھی تو کِرن روتے ہوئے اللہ تعالی سے میری صِحّت کی دُعا کر رہی تھی ۔ اُس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ مجھے کِرن کو بُرا نہیں سمجھنا چاہیے ۔"

"تو اب تمہارا کیا خیال ہے؟" سِلوی نے پوچھا۔

"میں اُسے دوست بنانا چاہتی ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟" صبا نے جواب دیا۔

سِلوی نے صبا کو ایک ترکیب بتائی ۔ اُس نے کہا کہ تم صُبح تین گلدستے بنانا اور جب ہم واپس جانے لگیں تو ایک میرے ابّو کو دینا، دوسرا مجھے اور تیسرا کِرن کو دے دینا ۔ کِرن سمجھ جائے گی اور بہت خوش ہو گی۔

صبا نے صبح صبح تین گلدستے بنائے۔ جب سِلوی اور اس کے ابّو کار میں بیٹھ کر ائر پورٹ جانے لگے تو صبا نے ایک گلدستہ انکل سٹیفن کو دیا اور دوسرا اپنی دوست سِلوی کو دے دیا ۔ کِرن کچھ دور پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔صبا نے کِرن کو آواز دی تو وہ ڈرتے ڈرتے اُس کے قریب آگئی ۔ صبا نے تیسرا گلدستہ کِرن کی طرف بڑھا دیا۔

"کِرن آج سے تم میری دوست ہی نہیں، بہن بھی ہو" صُبا نے کہا ۔

کِرن کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں ۔ اُس نے وہ گلدستہ صبا کے ہاتھ سے پکڑ کر شکریہ ادا کیا۔

صبا میں اِس تبدیلی کی وجہ سے سب بہت خوش ہوئے اور سب نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ سٹیفن اور سِلوی جب روانہ ہوئے تو صبا کے ہاتھ کے ساتھ کِرن کا گلدستے والا ہاتھ بھی لہرا رہا تھا۔

حضرت داتا گنج بخش
حضرت بہاؤالدین زکریا
حضرت بُوعلی شاہ قلندر
غوثِ اعظم
بابا فریدِ گنج شکر
خواجہ قطب الدین بختیار کاکی
پاک بی بیاں
حضرت خواجہ معین الدین چشتی
حضرت مجدد الف ثانی

فیروزسنز کی
گِفٹ بُکس
GIFT BOOKS

زندگی سنوارنے والی
کِتابیں
خود پڑھیے اور اپنے عزیزوں
اور دوستوں کو تحفے میں دیجیے

FEROZSONS (PVT.) **LTD.**
LAHORE – KARACHI – RAWALPINDI

کپڑے کی بُنائی اور سلائی

چوہدری امجد علی

بُنائی اور کتائی دنیا کی قدیم ترین صنعتیں ہیں ۔ یوں تو بُنی ہوئی اشیاء کی کئی قسمیں ہیں جن میں بوریا اور ٹاٹ بھی شامل ہیں ۔ لیکن سب سے اہم کپڑا ہے ۔ کپڑے کی تاریخ بہت پرانی ہے ۔ سب سے پہلے 4500 قبل مسیح میں کپڑا بنایا گیا ۔ کپڑا بُننے کے لئے دھاگے کی تیاری پہلا مرحلہ ہے ۔ یہ دھاگہ مختلف ریشہ دار چیزوں مثلاً روئی، ریشم اور اُون وغیرہ سے بنایا جاتا ہے ۔ روئی کپاس کے پودوں سے، ریشم ریشم کے کیڑے سے اور اون بھیڑ بکریوں سے حاصل کی جاتی ہے ۔ اس کے علاوہ انسان کے بنائے ہوئے مصنوعی ریشوں مثلاً "رے آن" (Rayon) اور "نائیلون" (Nylon) سے بھی دھاگہ تیار کیا جاتا ہے۔ "رے آن" لکڑی سے جبکہ "نائیلون" خام تیل سے تیار ہوتا ہے ۔

دھاگہ بنانے کے عمل کو کتائی کہا جاتا ہے ۔ قدرتی ریشوں کو کتائی کے عمل سے پہلے رنگ میں ڈبو کر باآسانی رنگا جا سکتا ہے۔ جبکہ مصنوعی ریشے اس عمل کے دوران نسبتاً مشکل سے رنگے جاتے ہیں ۔ یورپ میں چودھویں صدی تک کتائی ہاتھ سے کی جاتی تھی۔ تھوڑی سی اون یا روئی کو مروڑ کر دھاگے بنائے جاتے اور بعد میں انہیں ایک دوسرے سے جوڑ کر کافی لمبا دھاگہ تیار کر لیا جاتا ۔ مگر اس دھاگے کی جسامت یکساں نہیں ہوتی تھی ۔ کہیں سے موٹا اور کہیں سے باریک ہوتا تھا بعد میں اسی دھاگے کو ایک چرخی پر لپیٹا گیا اور اس چرخی کو گھومنے والے ایک پہیے سے جوڑ دیا گیا ۔ اس پہیّے کو ایک پائیدان کی مدد سے گھما کر عمدہ دھاگہ تیار کیا جانے لگا ۔

دھاگے سے کپڑا بنانے کے عمل کو "بنائی" اور بنائی کے لئے استعمال کی جانے والی مشین کو "لوم" (Loom) کہا جاتا ہے ۔ پرانے زمانے کی لوم لکڑی کی دو سلاخوں پر مشتمل تھی ۔ "تانا" بنانے کے لئے دھاگوں کو اِن کے درمیان کھینچ کر باندھ دیا جاتاہے۔ پھر ایک پھرکی میں کافی لمبا دھاگہ ڈالا جاتا ہے جسے "بانا" کہتے ہیں ۔ پھرکی کو تانے کے پہلے دھاگے کے اوپر سے

اور دوسرے کے نیچے سے گزارا جاتا ہے ۔ پھر تیسرے کے اوپر سے اور چوتھے کے نیچے سے ۔ غرض اسطرح پھرکی تانے کے ایک طرف سے دوسری طرف گذاری جاتی ہے ۔ واپسی پر یہ پھرکی ان دھاگوں کے نیچے سے گذاری جاتی ہے جن پر پہلے اوپر سے گذاری گئی تھی ۔ اسی طرح کپڑا تیار کیا جاتا ہے ۔ اب یہ عمل بہت حد تک خود کار بن گیا ہے ۔ جدید طرز کی پاور لوم ایک دن میں بیسیوں میٹر لمبا کپڑا تیار کر سکتی ہے ۔

کپڑے کو پہننے کے لئے سینے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ چنانچہ 1882ء میں ایک امریکی "والٹرہنٹ" نے پہلی سلائی مشین ایجاد کی ۔ اس میں دو دھاگوں سے سینے کا کام لیا جاتا ہے ۔ ایک دھاگہ مشین کے اندر چھوٹی سی پھرکی پر لپٹا ہوتا ہے ۔ جبکہ دوسرا دھاگہ نلکی کی صورت میں مشین کے اوپر "ریل" پر ہوتا ہے ۔ نلکی کے دھاگے کو ایک با حرکت بازو سے گزار کر سوئی کے نوکدار سرے سے گذارا جاتا ہے ۔ کپڑے کو جس مقام سے سینا ہو اسے سوئی کے نیچے رکھا جاتا ہے اور مشین کی ہتھی گھمانے سے سوئی اوپر نیچے حرکت کرتی ہے ۔ اس طرح پھرکی اور ریل کا دھاگہ باہم سلائی کا کام سرانجام دیتے ہیں ۔ سلے ہوئے کپڑے کو آگے حرکت دینے کے لئے تین یا چار کند دندانوں کی قطاریں ہوتی ہیں جنہیں "فیڈ ڈاگ" (Feed Dog) کہتے ہیں ۔ جدید سلائی مشینیں کئی طرح کے پیچیدہ نمونوں کی سلائی کر سکتی ہیں ۔

پیارے نبی

حضرت عائشہؓ

خدیجہؓ

حضرت علی

شاہدہ بیگم

حضرت ابو بکرؓ

حضرت عمرؓ

حضرت عثمانؓ

فیروز سنز کی

گفٹ بکس

GIFT BOOKS

زندگی سنوارنے والی

کتابیں

خود پڑھیے اور اپنے عزیزوں

اور دوستوں کو تحفے میں دیجیے

FEROZSONS (PVT.) **LTD.**

LAHORE – KARACHI – RAWALPINDI

آئیے، مُسکرائیں

ایک امیر آدمی نے ایک شخص کو نوکر رکھا اور اُس سے کہا "تُمہیں گھوڑے کی مالش کرنا، اُس کے لیے گھاس کھود کر لانا، اُس کا تھان صاف کرنا، تمام گھر کی صفائی کرنا، دو وقت کھانا پکانا، تین وقت چائے بنانا، بازار سے سودا لانا، برتن دھونا، دیگچیاں مانجھنا، رات کو میرے پاؤں دبانا اور اِس کے علاوہ اور بُہت سے کام کرنا ہوں گے۔"

نوکر نے پُوچھا "حضُور کے مکان کے قریب کوئی میدان بھی ہے؟"

امیر آدمی نے کہا "وہ کیوں؟"

نوکر بولا "فُرصت کافی ہوگی۔ فالتو وقت میں اینٹیں بھی بنایا کروں گا۔" (دھنیش کُمار۔ نواب شاہ)

رات کو بچّے کی آنکھ کُھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ اُس کے ابا جان اُس کا پانی والا پستول تانے کھڑے ہیں اور سامنے ایک چور نے ہاتھ اُوپر اُٹھا رکھے ہیں۔

بچّہ بھاگا بھاگا باہر گیا، گلاس میں پانی لایا اور باپ سے بولا "اِس میں پانی تو بھر لیجئے۔ بغیر پانی کے نہیں چلے گا۔" (علی رضا زیدی لاہور)

ٹریفک کے سپاہی نے ایک چھوٹی سی کار آتی دیکھی، جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک آدھ فُٹ اُوپر اُٹھتی تھی۔ وہ کار کے پیچھے لپکا اور ڈرائیور سے پُوچھا "کار میں کوئی خرابی ہے؟"

ڈرائیور نے کہا "کار میں تو کوئی خرابی نہیں۔ مُجھے ہچکیاں آ رہی ہیں۔" (کاشف عمران لاہور)

ٹرین میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے دُوسرے سے پوچھا:

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"لاہور" دُوسرے آدمی نے جواب دیا۔

"میں بھی وہیں جا رہا ہوں" پہلے آدمی نے کہا۔

"آپ کہاں رہتے ہیں؟" دوسرے نے پُوچھا۔

"سمن آباد میں" پہلے نے جواب دیا۔

"کون سی کوٹھی میں؟" دُوسرے نے پوچھا۔

"کوٹھی نمبر 2730 میں" پہلے نے جواب دیا۔

"لو! میں بھی وہیں رہتا ہوں" دُوسرے نے کہا۔

تیسرا آدمی اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُس نے حیرت سے کہا: "آپ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اور ایک دُوسرے کو نہیں جانتے!"

"جی، ہم دونوں باپ بیٹا ہیں۔ بس ویسے ہی وقت گزارنے کے لیے باتیں کر رہے تھے" پہلے آدمی نے کہا۔ (حسن مظفر لاہور)

دو آدمی ٹیلیفون کے تار ٹھیک کرنے کے لیے کھمبے پر چڑھ رہے تھے۔ سامنے سے ایک خاتُون کار چلاتی ہُوئی آئیں اور اُن آدمیوں کو دیکھ کر کہنے لگیں "بے وقُوف! ڈر کے مارے کھمبے پر چڑھ گئے ہیں۔ سمجھتے ہیں مجھے کار چلانی نہیں آتی۔" (شہزاد حاجی عُثمان کراچی)

ایک ماسٹر صاحب کا نام عبدالغفُور تھا۔ وہ ہر جُمعرات کو قبرستان جاتے اور مُردوں سے کہتے "السَّلامُ علیکُم یا اہلَ القبُور!" (یعنی اے قبر والو! تم پر سلامتی ہو) اِس کے بعد فاتحہ پڑھتے۔

ماسٹر صاحب کے شاگرد بُہت شریر تھے۔ اگلی جُمعرات کو وہ ماسٹر صاحب سے پہلے قبرستان پہنچ گئے اور ایک قبر کے پیچھے چُھپ کر بیٹھ گئے۔ اِتنے میں ماسٹر صاحب آئے اور بولے "السَّلامُ علیکُم یا اہلَ القبُور!"

لڑکے بولے "وعلیکُم السّلام، ماسٹر عبدُالغفُور!" (اعجاز احمد پیرزادہ۔ پاک پتن)

ایک آدمی کو دِن کے دو بجے ایک مچّھر نے کاٹا۔ آدمی نے کہا "میاں، تُم تو رات کی ڈیوٹی دیتے تھے۔ آج دِن میں کیسے آ گئے؟"

مچّھر بولا "جناب، آج میں اوور ٹائم کر رہا ہُوں۔" (سعدیہ ورک۔ سیالکوٹ)

جنگلی بِلّی

پاکستان کے زرعی اور صحرائی علاقوں میں پانی کے قریب اور جھاڑی دار زمینوں میں پائی جاتی ہے ۔ چُوہے، خرگوش ، پرندے اور کیڑے مکوڑے کھاتی ہے ۔ درخت پر بآسانی چڑھ جاتی ہے۔ شکار پر چُھپ کر حملہ کرتی ہے ۔ سال میں دو دفعہ بچّے دیتی ہے ۔ اس کا گھر جس میں بال وغیرہ بِچھے ہوتے ہیں ، کسی بِل یا جھاڑی میں ہوتا ہے ۔ چار تک بچّے ہوتے ہیں ۔ یہ تقریباً ۹ سال تک زندہ رہتی ہے ۔

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
R. L. NO. 4756 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00